معارفِ اقبالؒ

تصنیف

ڈاکٹر

غلام مصطفیٰ خان

ایم اے۔ ایل ایل بی۔ پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

مقدّمہ

جناب سیّد حسین امام

ناشر

اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

شیخ شوکت علی اینڈ سنز
بندر روڈ۔ کراچی

معارفِ اقبال

تصنیف

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

مُقدّمہ

جناب سیّد حسین صاحب

اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس،
سنہ ۱۹۷۸ء

جملہ حقوقِ دوامی بحقِ کانفرنس اکیڈمی محفوظ

ناشر

سید الطاف علی بریلوی (علیگ)

سکریٹری

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

10/45 ـ ل ـ 1 ناظم آباد ـ بی روڈ ـ کراچی

تعداد طبع — ایک ہزار

قیمت — بارہ روپے (12)

طابع — ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس کراچی

۶۱۹۷۸

فہرست مضامین

انتساب

برادرِ محترم پروفیسر حمیدؔ جالندھری کے نام

احقر: غلام مصطفےٰ خاںؔ

پیش لفظ

از جناب مولوی سیّد حسین امام
نائب صدر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

اکابر و اسلاف کی یاد منانا اور اُن کے کارناموں کو نئی نسل سے روشناس کرانا ایک قومی فریضہ ہے۔ زندہ قومیں اپنے بزرگوں کے نام اور کام کو ہمیشہ یاد رکھتی ہیں۔ اسی اصول کے پیشِ نظر سنہ ۱۹۷۶ء قائدِاعظم محمدؐ علی جناحؒ کے صد سالہ جشن پیدائش کا سال قرار دیا گیا۔ ملت پاکستان نے اپنے قائد کے حضور میں اس موقع پر شایانِ شان طریقے پر خراجِ عقیدت پیش کیا۔ علمی اداروں، مصنفین اور دانشوروں نے قائدِاعظم اور تحریکِ پاکستان پر بہت سی معیاری اور تحقیقی کتابیں لکھیں اور شائع کیں۔ اور رسائل و جرائد نے یادگار نمبر نکالے۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے بھی اس یادگار موقع پر اپنے سہ ماہی آرگن "العلم" کا ایک خاص نمبر نکالا اور جلسے منعقد کئے۔ العلم کا یہ نمبر علمی و ادبی حلقوں میں نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ ممتاز اہلِ علم اور دانشوروں نے اچھے تبصرے کئے۔

۱۹۷۷ء حکیم الامت حضرت علامہ محمد اقبالؒ کا سال قرار دیا گیا۔ علامہ اقبال ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء کو شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تھے! انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ملتِ اسلامیۂ ہند کو بیداری کا پیغام دیا۔ وہ ملّی شاعر، عظیم قائد، ممتاز فلسفی اور ملتِ اسلامیۂ ہند کے مخلص رہنما تھے۔ انھوں نے مختلف النوع طریقوں سے قوم کی خدمت و تربیت کی اور عملی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ ہندوستان بلکہ دنیا کے کسی کونے یا گوشے میں اگر مسلمانوں کو رنج پہنچتا تو علامہ اقبال بے چین و بے قرار ہو جاتے۔ انھوں نے پاکستان کے نظریئے کو باقاعدہ طور سے پیش کیا، مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد ۱۹۳۰ء کا خطبۂ صدارت ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے متحدہ قومیت کے سحر اور اکھنڈ بھارت کے طلسم کو ضرب کلیمی سے توڑ کر رکھ دیا۔ جہاں بعض "صاحبانِ جبہ و دستار" مات کھا گئے وہاں اس "مرد قلندر" نے نے پورے طور سے حق آگاہی اور حقیقت شناسی کا ثبوت دیا۔

علامہ اقبال کے صد سالہ جشنِ پیدائش کے موقع پر بھی ملتِ پاکستان نے ان کے شایانِ شان" اظہارِ عقیدت و مسرت کیا۔ سرکاری سطح پر لاہور میں ایک بین الاقوامی کانگریس (دسمبر ۱۹۷۷ء) میں منعقد ہوئی۔ پاکستان کے علاوہ دنیا کے بیس سے زیادہ ملکوں نے اس میں شرکت کی، دو سو سے زیادہ علماء و محققین شریک ہوئے۔ انہوں نے اقبال کے پیغام، شاعری اور

فلسفہ پر اظہار خیال کیا۔ اس موقع پر حضرت علامہ سے متعلق بہت سی علمی و تحقیقی کتابیں شائع ہوئیں۔ ملک میں بکثرت جلسے اور سیمینار منعقد ہوئے۔ رسائل و جرائد نے خصوصی نمبر نکالے۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے بھی ایک وقیع جلسہ منعقد کیا جس میں ممتاز دانشوروں اور علماء نے علامہ اقبال کی سیرت و پیغام پر اظہار خیال کیا۔ کانفرنس نے العلم کا ایک خاص نمبر بھی شائع جس میں نامور اہلِ قلم اور مشہور محققین کے علمی و تحقیقی مقالے شامل ہیں اور العلم کا یہ اقبال نمبر بھی علمی و ادبی حلقوں میں خاص پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔

کانفرنس نے اس موقع پر ایک یادگار کتاب "معارفِ اقبال" کی اشاعت کا بھی پروگرام بنایا۔ خوش قسمتی سے یہ کتاب ملک کے نامور عالم و محقق پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں (علیگ) سابق صدر شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی (حیدر آباد سندھ) کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، ملک کے نامور مصنف، ادیب، عالم اور شیخِ طریقت ہیں، علامہ اقبال کی دینی فکر اور مذہبی و علمی رجحانات کے تجزیئے کے لئے پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب ہی کا قلم حقیقت رقم چاہیئے تھا۔

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کی تمام زندگی درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور اصلاح و تذکیر سے عبارت رہی ہے، انہوں نے تدریسی فرائض کے ساتھ تصنیف و تالیف کے میدان میں جو یادگار کارنامے انجام دیے ہیں وہ علمی و ادبی تاریخ کا روشن باب ہیں۔

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، ۱۰ ر شوال ۱۳۳۰ھ (مطابق ۲۳ ر ستمبر ۱۹۱۲ء) کو جبلپور

(سی۔ پی) میں پیدا ہوئے وہ ایک متوسط الحال خاندان کے رکن ہیں۔ شرافت، اعلیٰ اخلاق مشرقی تہذیب اور اسلامی وابستگی میں یہ خاندان ممتاز تھا۔ انہوں نے تمام تر تعلیم ملک کے مشہور تعلیمی ادارہ "مسلم یونیورسٹی علی گڑھ" میں حاصل کی۔ ڈاکٹر محمد مسعود احمد دہلوی لکھتے ہیں۔[۵۱]

"سانولا رنگ، گول چہرہ، بھرواں داڑھی، بڑی بڑی آنکھیں، کشادہ پیشانی، دراز قامت، نرم گفتار و نرم رفتار، چہرہ مظہرِ رعب و جلال، عادات و اخلاق، کاشفِ حسن و جمال، جو ملتا ہے دل دیے بغیر نہیں رہتا، عجز و انکسار ایسا کہ طبقۂ علماء میں ڈھونڈنے سے نہ ملے گا۔ چھوٹوں کے حد سے زیادہ شفیق، بزرگوں کا حد سے زیادہ ادب، پیکرِ ذہانت و فطانت ہیں، چھوٹی سی عمر میں قرآن کریم ختم کر لیا۔ ہمیشہ اپنی جماعت اوّل رہے ۱۹۲۸ء میں نویں جماعت پاس کرنے کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔ یہاں آٹھ سال (۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۶ء) قیام رہا۔ ایم۔ اے (فارسی) ایم۔ اے (اردو) ایل ایل بی وغیرہ میں امتحان دے کر ۱۹۳۶ء میں فارغ ہوئے۔ علی گڑھ کے زمانہ قیام میں عربی بھی پڑھی اور فن تجوید و قراءت میں بھی سند حاصل کی۔ ۱۹۴۶ء میں ناگپور یونیورسٹی (بھارت) سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ پھر ۱۹۵۹ء میں مندرجہ ذیل تصانیف پر اسی یونیورسٹی سے ڈی۔ لٹ کی ڈگری لی۔

۵۱۔ ماہنامہ "رشاد" سیالکوٹ اگست ستمبر ۱۹۷۳ء ص ۸۸۔ ۸۹

۱۔ احسانی کا ذہنی ارتقا مطبوعہ کراچی ۱۹۵۶ء

۲۔ فارسی پر اُردو کا اثر مطبوعہ ۱۹۵۲ء طبع اول ۱۹۶۱ء طبع دوم

۳۔ علمی نقوش، مطبوعہ کراچی ۱۹۵۷ء

پی۔ ایچ۔ ڈی کا موضوع سید حسن غزنوی تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ سلطان بہرام شاہ غزنوی کی تاریخ بھی لکھی۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب نے اپنے دور کے نامور اساتذہ سے مختلف علوم و فنون میں استفادہ فرمایا۔ اس سلسلہ میں وہ خود لکھتے ہیں[1]۔

"وہاں (علی گڑھ) ہائی اسکول سے لے کر ایم۔ اے تک مولانا احسن مارہروی مرحوم اور پروفیسر ضیاء احمد صاحب سے مستفیض رہا اور حضرت قاری ضیاء الدین احمد الہ آبادی، مولانا ابوبکر شیث جونپوری اور مولانا سید سلیمان اشرف کی خدمت میں بھی شرف یاب رہا پھر نواب صدر یار جنگ (حبیب الرحمن خاں شروانی) اور علامہ سلیمان ندوی نے بار بار ملاقات اور نصف ملاقات میں یہی فرمایا: "لکھو اور لکھتے رہو" ——— پروفیسر حافظ محمود شیرانی مرحوم، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب اور علامہ محمد شفیع صاحب نے بھی کرم بخشی فرمائی اور انھوں نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (اردو) کے لئے میرے متعدد مضامین منظور فرماکر حوصلہ افزائی فرمائی۔"

---

[1] علمی نقوش از ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں، کراچی ۱۹۵۷ء صہ ۵

جولائی ۱۹۳۶ء میں ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کا تقرر بحیثیت لکچرار کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی میں ہوا۔ اور دس سال تک انہوں نے اس کالج میں تدریس کے فرائض انجام دیئے۔

۱۹۴۷ء میں مارلین کالج ناگپور میں تبادلہ ہوگیا۔ تا آنکہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان وجود میں آگیا اور ڈاکٹر صاحب جنوری ۱۹۴۸ء میں مستقل طور سے پاکستان آگئے۔ اول اسلامیہ کالج میں اور بعدہٗ اُردو کالج کراچی میں تقرر ہوگیا اور ۱۹۵۶ء تک وہاں رہے۔ ۱۹۵۶ء میں سندھ یونیورسٹی (حیدر آباد سندھ) میں صدر شعبۂ اُردو کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کو پروان چڑھایا۔ اور سندھ یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد اور ساتذہ نے بڑی قدر و منزلت فرمائی۔

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں اُردو اور فارسی کے اُستاد اور یگانۂ روزگار محقق ہیں۔ تقریباً نصف صدی سے اس دشت کی سیّاحی میں مصروف ہیں۔ ان کی نگرانی اور رہنمائی میں کم و بیش پچیس ۲۵ تینس ۳۳ حضرات نے ڈاکٹریٹ کیا اور ۴۰۰ سے زیادہ مونوگراف (ایم۔ اے فائنل) کے لکھے جاچکے ہیں۔ خود ڈاکٹر صاحب کی تصنیفات و تالیفات ۸۱ سے متجاوز ہیں پانچ کتابوں کا فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ تقریباً بیس ۲۰ کتابیں ان کی ترتیب و تہذیب سے شائع ہوچکی ہیں۔ پھر مقالات، مقدمات و مکتوبات اس کے علاوہ ہیں۔

فارسی زبان و فرہنگ پر ڈاکٹر صاحب کا بڑا وقیع کام ہے ڈاکٹر صاحب

کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تصانیف عالیہ اور مجددی سلسلہ کے ادب کو جدید انداز پر زیورِ طبع سے آراستہ کر کے وقفِ عام کیا اور بہت سے رسائل و کتب جو نادر و نایاب تھیں انہیں ترتیب و تہذیب کے بعد شائع کیا۔ ڈاکٹر صاحب مجددی سلسلہ کے ایک نامور شیخِ طریقت ہیں۔ آپ کے اسلوبِ تحریر کے سلسلہ میں مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم لکھتے ہیں[۱]:۔

"اردو سیدھی سادی، صحیح، سلیس اور شستہ لکھتے ہیں جیسی ہر شخص کو لکھنی چاہیئے جس کی مادری زبان اردو ہے۔ جنات کی زبان نہیں لکھتے ان کا ذوقِ سلیم ہے اور علامہ سید سلیمان ندوی اور صدر یار جنگ شروانی کے مکتب تربیت کے فیض یافتہ ہیں۔ تنقیدی مضامین نثر عموماً سلجھے ہوئے شائستہ اور متوازن ہوتے ہیں۔ تحقیقی مضامین اندازِ بحث سنجیدہ اور مدلل ہوتا ہے متانت کا دامن کسی حال میں چھوٹنے نہیں پاتا۔"

ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم (ف ۱۹۶۳ء) لکھتے ہیں[۲]:۔

"ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں سے مجھے عرصہ سے ادبی موضوعات پر قیمتی تحقیقی مضامین اور مقالات کے ممتاز مؤلف کی حیثیت سے تعارف حاصل ہے جو پاک و ہند کے بہت سے علمی رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔"

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی اس کتاب "معارفِ اقبال" میں کل نو مضمون شامل ہیں۔

۱ؔ صدق جدید لکھنؤ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۵۷ء

۲ؔ دیباچہ سید حسین غزنوی از ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں لاہور ۱۹۵۵ء

اس کتاب میں شعری، مذہبی اور ملی رجحانات کا خاص طور سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ علامہ اقبالؔ نے شعر و ادب کے ذریعہ ملتِ اسلامیہ کی بیداری اور سیاسی شعور کی تربیت میں جو حصہ لیا ہے اس کا عکسِ جمیل ہمیں ان مقالات میں ملتا ہے۔ اور ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کا نظریۂ شعر و ادب کن عظمتوں سے ہم کنار تھا۔

علامہ اقبالؔ ایک صوفی باپ کے بیٹے تھے باقاعدہ قادری سلسلے میں منسلک تھے۔ اور تصوف کی حقیقت و ماہیت سے واقف مگر ساتھ ہی روایتی تصوف اور متصوفین کے ناقد بھی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں چونکہ خود اس بحرِ حقیقت کے غواص ہیں لہٰذا انہوں نے علامہ اقبال کے صوفیانہ نظریات اور افکارِ تصوف پر خوب لکھا ہے۔

حضرت علامہ مرحوم عشقِ رسولؐ میں ڈوبے ہوئے تھے ان کے اشعار اُس خوشبوئے جانفزا میں بسے ہوئے ہیں، جہاں ذکرِ رسول ہے وہاں اقبالؔ ہے۔ اور ان کے قلب کی یہ کیفیت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آتے ہی آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح اقبال کا کلام حدیثِ نبوی کے حوالوں سے مُزیّن ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے اس موضوع پر خوب لکھا ہے۔ یہی کیفیت دوسرے مضامین کی ہے۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس "معارفِ اقبال" کی اشاعت پر مبارکباد کی مستحق ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب بھی کانفرنس کی دوسری مطبوعات کی طرح قبولِ عام حاصل کرے گی۔ بلکہ اُن سے کہیں زیادہ۔

۸ر فروری ۱۹۷۸ء

حُسین امام

کلامِ اقبالؒ

— کا —

تاریخی و سیاسی پس منظر

علامہ اقبال کے کلام اور ان کی تلمیحات کو سمجھنے سے پہلے بہتر یہ ہے کہ ان کے کلام کا سیاسی پس منظر بھی سمجھ لیا جائے۔ ان کے کلام کو اس نوعیت کے اعتبار سے تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) شروع سے ۱۹۱۱ء تک (۲) ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۳ء تک اور (۳) ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک

پہلا دور اقبال کے کلام کی شہرت ۱۹۰۱ء کے پہلے سے ہونے لگی تھی۔ "نالۂ یتیم" ان کی پہلی نظم کہی جاتی ہے۔ پھر "ہمالہ" لکھی گئی جو اپریل ۱۹۰۱ء میں "رسالہ مخزن" میں پہلی بار شائع ہوئی۔ "تصویرِ درد" ۱۹۰۴ء میں لکھی پھر اسی دور میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک قیام یورپ کے زمانے کا کلام بھی آجاتا ہے جس میں ان کے مستقبل کی شاعری کی پوری جھلک موجود ہے۔ مثلاً اسلام کے عالمگیر تصور کا تذکرہ طلبۂ علی گڑھ کالج سے کرتے ہیں۔

جذبِ حرم سے ہے فروغِ انجمن حجاز کا
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

سخت کوشی کی بھی تلقین ہے۔

یہ تلاشِ متصل شمع جہاں افروز ہے
توسنِ ادراک انساں کو خرام آموز ہے (گلِ رنگیں)

بیابانِ طلب پیوستہ می کوشیم ما
موجِ بحریم و شکست خویش بر دوشیم ما (عاشق ہرجائی)

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ کام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے (کوشش ناتمام)

اقبال کو اسی زمانے میں (۱۹۰۷ء) مغربی تہذیب کا جنازہ دکھائی دے رہا تھا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اس زمانے میں تلک کے علاوہ بپن چندرپال اور کھاپرڈے نے کانگریس کو انگریزوں کے خلاف جنگ آزمائی کے لئے ضرور تیار کیا تھا لیکن ساتھ ہی ایک ہندو انقلابی جماعت کی بھی تشکیل کی تھی۔ ان کے برعکس دادا بھائی نوروجی، فیروز شاہ مہتا اور گوکھلے نے ہندوستان کی تمام اقوام کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ محمد علی جناح بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ اقبال رح نے ہندوستان کے فرقہ ساز اور ہندو عصبیت والے لیڈروں کے متعلق لکھا تھا۔

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آزری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

گو کہ ان کے اس ابتدائی دور میں بھی اسلام کا عالمگیر تصور ملتا ہے۔ لیکن اس زمانے میں ہندوستان میں فرقہ وارانہ تعلقات خراب نہیں ہوئے تھے اور اقبال وطن چھوڑ

کر یورپ جانے والے تھے۔ اس لئے ان کے کلام میں اس وقت حُبِّ وطن کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ ہمالہ، صدائے درد، تصویرِ درد، ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، نیا شوالہ میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے۔ حبِ وطن کے علاوہ اس دور میں منظر نگاری بھی جگہ جگہ ملتی ہے۔ مختلف مناظر کی تصویر بڑی خوبی سے کھینچی ہے۔ لیکن اس منظر نگاری میں اُن کے مستقبل کی جذبات نگاری بھی پائی جاتی ہے، ہمالہ، ایک آرزو، ماہِ نو، کنارِ راوی اور حسن وغیرہ میں یہ خصوصیت عام ہے۔ مثلاً ماہِ نو میں ہے۔

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل
طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب
چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی

اور آگے چل کر کہتے ہیں۔

ساتھ اے سیارۂ ثابت نما لے چل مجھے
خارِ حسرت کی خلش رکھتی ہے اب بے کل مجھے

یہ منظر نگاری بعد میں جذبات نگاری میں منتقل ہو جاتی ہے اور بعد کے مجموعوں میں محض منظر نگاری بہت کم رہ جاتی ہے اس دور میں (۱) حب الوطنی اور (۲) منظر نگاری کے علاوہ (۳) لفظ تراشی بھی ہے۔ اقبال کو لفظ تراشی کا خاص شوق تھا ان کے کتابوں کے نام ہی اس ذوق کے لئے دلیل ہیں۔ ان کے علاوہ خود "بانگِ درا" میں ایسے الفاظ بہت ملتے ہیں۔

ع گھر یہ بولا صدف نشینی ہے مجھ کو سامانِ آبرو کا
وہی فطرت اسد اللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

ع فیض ساقی شبنم آسا ظرفِ دل دریا طلب

ع دعائے طفلک گفتارِ آزما کی مثال

ع کشتِ خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار

ایسی بے شمار مثالیں دوسرے مجموعوں میں بھی بہت مل سکتی ہیں یہ تو ایک تعمیری دور تھا جس میں اقبال کی شاعری اور ان کے نظریات تشکیل پا رہے تھے اور یہی دراصل ان کے کلام کا پیش خیمہ ہیں۔

دوسرا دور یہ دور بہت اہم ہے۔ بانگِ درا ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی لیکن اس میں ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۴ء تک کے تمام اہم سیاسی واقعات کے متعلق تلمیحات ملتی ہیں۔ ۱۹۰۸ء میں ترکوں کے خلاف کامیابی حاصل کر کے سلطان عبد المجید (المتوفی ۱۹۱۸ء) کو علیحدہ کر دیا۔ سلطان کے عہد میں ترکوں میں بڑی کمزوری واقع ہو رہی تھی۔ اس لیے انھوں نے اپنی خلافت کی پروا نہ کرتے ہوئے ترکوں کی آزاد تحریک کو نہ پنپنے دیا۔ لیکن اس کے علیحدہ ہو جانے پر ترکوں نے ابھی پوری قوت حاصل نہ کی تھی کہ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس الغرب پر حملہ کر دیا ہندوستان کے مسلمانوں کو سخت صدمہ ہوا۔ مولانا ظفر علی خاں وغیرہ نے چندہ فراہم کیا اور ایک طبی وفد کے ساتھ مولانا موصوف خود قسطنطنیہ گئے۔ یہ جذبہ انگریزوں کو ناپسند ہوا اور انھوں نے مسلمانوں پر سختیاں شروع کیں۔ اور مولانا کو واپسی پر قید کر دیا اور ان کا پریس اور اخبار "زمیندار" ضبط کر لیا گیا۔ یہ مظالم (SIR M. O'DWYER) کے ایما پر ہوئے کیونکہ پنجاب میں اسی کی حکومت تھی اس زمانے میں اقبال نے صاف طور پر انگریزوں کے خلاف کچھ نہیں

کہا۔ لیکن ان مظالم کے چڑھتے ہوئے دریا کا اترنا ضرور انھیں نظر آرہا تھا

دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی

(صـ۲۱۵) اس شعر کے سلسلے میں یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ جنگِ عظیم کی تباہی کے بعد جب ترکوں نے اپنی حالت درست کی اور فرنگیوں کے مظالم ختم ہونے لگے تو فرمایا۔

تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج
موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

(صـ۳۲) طرابلس کے متعلق اقبالؔ کے کلام میں تذکرہ ہے بلکہ انھوں نے ۱۹۱۲ء میں ایک نظم فاطمہ بنت عبداللہ پر لکھی تھی۔ جو غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوئی تھی ایک جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں ہدیۂ دل پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں صـ۲۱۹

لیکن وہ اس عارضی غم کے اختتام کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے
یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار
فتحِ کامل کی خبر دیتا ہے جوشِ کارزار

مسلمانوں پر جو مظالم ہوئے تھے اور ہندوستان سے لے کر افریقہ تک

کے مسلمان جس ابتری میں تھے اس سے اقبال کے دل پر سخت صدمہ گزرا اور انھوں نے پریشان ہوکر اسی سال یعنی ۱۹۱۲ء میں "شکوہ" لکھا پھر مسلمانوں کے مرض کا علاج بھی اسی سال کے آخر میں "جواب شکوہ" میں بتایا۔ یہ سال اس لئے اور بھی اہم ہے کہ انھوں نے اسی سال "شمع و شاعر" نظم لکھی جس میں سب سے پہلے ان کی خودی کا نظریہ ملتا ہے۔

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے

ہفت کشور جس سے ہوں تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

اسی سال انھوں نے اپنی مشہور فارسی مثنوی "اسرارِ خودی" لکھنی شروع کی جو ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی اور اسی کے ساتھ رموز بے خودی بعد میں شامل کردی گئی جو ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔ پھر پروفیسر نکلسن نے "اسرارِ خودی" کا ترجمہ کر کے یورپ اور امریکہ میں اقبال کا کلام پہنچایا۔

اکتوبر ۱۹۱۲ء میں یورپ کی بڑی طاقتوں کی شہ پاکر بلقان کی ریاستوں یعنی سربیہ SARBIA ۔یونان GREECE بلغاریہ BULGARIA مانٹی نیگرو MOUNTE NEGROO نے اتفاق کر کے یہ ارادہ کیا کہ مقدونیہ MACEDONIA ترکوں سے چھین لیا جائے۔ چنانچہ حملہ کردیا۔ بلغاریہ پیش پیش تھا "جواب شکوہ" جو اس زمانے میں لکھا جارہا تھا اسی واقعہ کا ذکر ہے۔

ہے جو ہنگامہ بپا یورشِ بلغاری کا
غافلوں کے لئے پیغام ہے بیداری کا

بلغان کی ان ریاستوں نے ADRIANOPOL کا محاصرہ کیا اور ایک عرصہ کے بعد ۱۹۱۲ء میں اسے لے لیا۔ مولانا شبلی نے بھی اس موقع پر نظم و نثر میں مسلمانوں کا غم کیا تھا۔ اقبال نے "محاصرہ ادرنہ" کا ذکر صـ۲۴ میں کیا ہے اس فتح کے بعد یونان اور سربیہ نے بلغاریہ سے تقسیم مقبوضات کے سلسلے میں جنگ کی اور ان کے ساتھ رومانیہ بھی شامل ہوگیا۔ ترکوں نے موقع پا کر ادرنہ واپس لے لیا اور تھریس کا علاقہ بھی لے لیا۔ لیکن ترکی کی دوسری مقبوضات بلقانی ریاستوں میں تقسیم ہوگئیں اور ایک نئی حکومت البانیہ وجود میں آئی۔ یہ حکومت گو کہ جنگِ عظیم میں اٹلی کے قبضہ میں آگئی تھی لیکن بعد میں پھر آزاد ہوگئی۔

پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک رہی آسٹریا نے سربیہ پر حملہ کیا تھا۔ آسٹریا کی حمایت میں ترکی، جرمنی اور بلغاریہ تھے اور سربیہ کے ساتھ روس، فرانس، بلجیم اور برطانیہ وغیرہ تھے۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۵ء تک برطانیہ اور فرانس نے بڑی کوشش کی کہ درہ دانیال پر قبضہ ہو جائے۔

GALIPOLI کے خشک راستے بھی حملہ کیا لیکن ترکوں نے ہمیشہ پسپا کیا۔ پھر ۱۹۱۵ء انگریزوں نے کرنل لارنس کو مصر اور ترکی بھیجا۔ وہاں سے وہ عرب گیا۔ اور عربوں کو ترکوں کے خلاف ورغلایا۔ ترکوں کا منفرد کیا ہوا حجاز کا "شریف" (یعنی گورنر) جس کا نام حسین تھا انگریزوں سے مل گیا اور ۱۹۱۶ء میں حجاز کا خود مختار حاکم بن بیٹھا۔ اس کا لڑکا فیصل بھی ترکوں سے لڑتا رہا۔ حسین ۱۹۲۴ء

تک حجاز کا حاکم رہا پھر نجدیوں نے اسے بھگا دیا اور اس کی جگہ ابن سعود حاکم ہوا۔ حسین کے متعلق اقبال کہتے ہیں۔

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰ
خاک وخوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش (صفحہ ۲۹)

اس جنگ میں ترکوں کے ہاتھ سے عراق، مصر، فلسطین، حجاز وغیرہ نکل گئے اور انگریزوں کے زیرِ انتداب آگئے۔ ترکوں پر سخت مظالم ہوئے گویا مشرق اور مغرب کے مسلمانوں کے دل لرز گئے اقبال نے ایک عالمگیر تصور یعنی اتحادِ اسلام یا PAN ISLAMISM کی تحریک ۱۹۱۲ء میں شروع کی تھی وہ ۱۹۱۸ء تک برابر زور پکڑتی رہی۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بےخودی کے ذریعے انھوں نے اپنے اس نظریے کی اشاعت دوسرے ممالک میں کی۔ بانگِ درا میں بھی اس کے متعلق جگہ جگہ کہتے ہیں۔ ایک جگہ ہے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

جنگِ عظیم کے بعد ہندوستانیوں کو امید تھی کہ جنگی امداد کی بنا پر حکومت اپنے وعدے کے مطابق انھیں پورے حقوق دے گی لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ اسی زمانے میں حکومت نے ROWLETT BILL پاس کر دیا جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے تمام انقلابی عناصر کو ختم کیا جا سکے اور لوگوں کو بغیر کسی خاص تحقیقات کے سخت سزائیں دی جائیں۔ گاندھی نے اس بل کے خلاف ستیہ گرہ کی تحریک شروع کی۔ ۱۲ اپریل

۱۹۱۹ء کو تمام ملک میں ستیہ گرہ کی گئی۔ امرتسر میں جلیانوالہ باغ کے جلسہ کے خلاف حکم امتناعی کا نفاذ ہوا اور جلسہ شروع ہوا ہی تھا کہ جنرل O'DWYER اپنا ایک دستہ لے کر پہنچا اور مشین گن سے دس منٹ کے اندر ۳۷۹ آدمیوں کو لقمۂ اجل بنایا اور ۱۲۰۸ آدمی سخت زخمی ہوئے۔ اس سانحے سے پورے ملک میں آگ لگ گئی اور گاندھی نے ترکِ موالات کی تحریک شروع کر دی۔ اس سے قبل "علی برادران" نے ۱۹۱۸ء میں تحریک خلافت شروع کی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں بھی ساتھ ساتھ کام کر رہے تھے۔ لیکن اب گاندھی جی کے کہنے پر امرتسر کانفرنس میں ان لوگوں نے کانگریس کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔

مولانا محمد علی جوہر ترکِ موالات کی تحریک سے پہلے خلافت وفد لے کر انگلستان گئے تاکہ وہاں کے سیاسی لیڈروں کی امداد سے خلافتِ عثمانیہ کو سنبھال لیا جائے۔ لیکن اقبال نے اس نظریے کی سخت مخالفت کی اور صاف صاف بتایا:

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے — تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟ — خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے — مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی
مرا از شکستن چنیں عار ناید — کہ از دیگراں خواستن مومیائی

وہ تو اسلاف والی خلافت چاہتے تھے چنانچہ ۱۹۲۲ء میں خضرِ راہ میں کہتے ہیں۔

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار — لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

۱۹۲۲ء میں انگریزوں نے GOVERNMENT OF INDIA ACT
پاس کیا۔ اسکی رو سے صوبائی اور مرکزی LEGISLATIVE ASSEMBLY
"مجلس آئین" کا قیام ہوا۔ اقبال کہتے ہیں۔

مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق ۔۔۔ طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیٔ گفتار اعضائے مجالس الاماں ۔۔۔ یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
صفحہ ۲۹

اسی نظم "خضرِ راہ" ۱۹۲۳ء میں آگے چل کر کہتے ہیں۔

نسل قومیت کلیسا، سلطنت تہذیب رنگ ۔۔۔ خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کیلئے ۔۔۔ سکر کی لذت سے تو لٹوا گیا نقدِ حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار ۔۔۔ انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
صفحہ ۲۹۸

لیکن اقبال نے قوم کو ہمت دلائی اور بتایا کہ ہم کو مایوس ہو کر نہ بیٹھنا
چاہیے کیونکہ:۔ یہ نکتہ سرگذشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمیں میں ایشیا کا پاسباں تو ہے صفحہ ۳۰۷

یہ شعر طلوعِ اسلام میں ہے جو ۱۹۲۳ء کی نظم ہے اسی میں ایک جگہ کہتے ہیں۔

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے ۔۔۔ تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

مغرب کے خلاف ہندوستان میں محاذ قائم ہو چکا تھا۔ بنگال کے سی۔آر داس نے بھی اسی سال یعنی ۱۹۲۳ء میں ALL ASIA FEDERATION کی تجویز پیش کی تھی اور مغرب کے خلاف مشرق والوں کو متحد کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن بعض وجوہ سے دونوں قومیں پھر اپنے اپنے تحفظ کے لئے الگ الگ راہیں ڈھونڈنے لگیں۔ جنگِ عظیم کے بعد مصطفٰے کمال پاشا نے سنبھلنے کی کوشش کی ۱۹۱۹ء

میں ANGORA میں نئی حکومت قائم کی ۱۹۲۲ء میں یونان کو شکست دی اور ۱۹۲۳ء میں مشرقی تھریس وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ خلیفہ کا اثر ختم کر کے ترکی میں جمہوری حکومت قائم کی۔ یہ سب کچھ ترکوں کی ہمت اور استقلال کی بدولت ہوا اور انھوں نے تمام مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے — کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

جنگِ عظیم میں سخت ترین نقصانات اٹھانے کے باوجود ترکوں نے جرمنی سے بھی پہلے خود کو سنبھال لیا۔ یہ محض ایمان کی برکت تھی۔

ثبات زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں — کہ المانی سے بھی پایندہ تر نکلا ہے تورانی

۱۹۲۳ء تک اقبال کے کلام کا دوسرا دور ختم ہو جاتا ہے وہ ۱۹۰۸ء تک یورپ میں رہے تھے انھیں فلسفہ کا خاص شوق تھا اور اپنے مقاصد میں انہیں مشرق اور مغرب کے تمام مفکرین کو بھی پڑھنا پڑا۔ فرانس کے (۱۸۵۹ء سے ۱۹۳۶ء) کے INTUITION کی بحثوں کا مطالعہ کیا KANT (۱۷۲۴ء ۱۸۰۶ء) کے CRITIQUE OF PUREREASAN پر تنقید کی جرمنی کے نطشے (۱۸۴۴ء ۱۹۰۰ء) سے اثر لیا تھا۔ اس کے متعلق کہنا پڑا۔

قلب او مومن دماغش کافر است

براؤننگ کے کلام کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا گوئٹے کے تصوف اور مشرق پسندی کی بھی تعریف کی لیکن مشرقی مفکرین بہت کچھ مختلف تھے۔

صحابہ کرامؓ اور تابعین کے بعد زاہدانہ زندگی بسر کرنے والے بزرگوں میں دوسری صدی ہجری کے ابوہاشم کوفی (معاصر ابوسفیان ثوری) پہلے شخص

ہیں جو صوفی کہلائے گئے۔ بعض کے نزدیک اسی صدی کے جابر بن حیان کو فی سب سے پہلے صوفی ہیں۔ لیکن یہ بزرگ صرف زاہدانہ اور قانع زندگی کی وجہ سے صوفی کہلائے جاتے تھے۔ بعد میں حضرت بایزید بسطامیؒ اور شیخ جنید بغدادیؒ نے اپنے ذوق اور وجدان سے وحدت الوجود کا مسئلہ چھیڑا اور ایک عرصے کے بعد شیخ محی الدین ابن عربی نے وحدت الوجود والے تصوف کو اپنے استدلال سے فلسفہ بنا دیا لیکن امام غزالیؒ نے اپنے اجتہاد سے اسلام اور تصوف کو فلسفے سے بچا لیا۔ آخر کار ہمارے مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے وحدت الوجود کے مقابلے میں وحدت الشہود کا عقیدہ قائم کر کے قرآن اور حدیث کے اتباع پر زور دیا اور سب سے آخر میں شاہ ولی اللہ کا ظہور ہوا۔ جنھوں نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ مشرق کے ان مفکرین سے اقبالؔ نے استفادہ کیا اور مغرب کے فلسفیوں سے صرف اتنا تعلق رکھا جتنا کہ اسلام کے منافی نہ تھا۔ شیخ محی الدینِ ابن عربی اور ان کے مقلدین میں کرمانی، عراقیؔ حافظؔ وغیرہ نے وحدت الوجود کا جو فلسفہ رائج کیا اقبالؔ نے اس کی سخت مخالفت کی کیونکہ خدا کے علاوہ پوری مخلوق کا وجود اگر موہوم سمجھ لیا جائے تو قنوطیت بے عملی اور بے مرکزی پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ اقبالؔ نے خودی کے نظریئے سے خود شناسی سکھائی تاکہ انسان اپنے بلند درجے کا احساس پیدا کرے اور اپنی پوشیدہ قوتوں کو بیدار کرے۔ خودی کی تکمیل کے لئے جیسا کہ انھوں نے "اسرارِ خودی" میں بیان کیا ہے۔ تین چیزوں کو ضروری سمجھا ہے (۱) اطاعت یعنی سب سے پہلے فرائض اور قوانینِ الٰہی کی پابندی کی جائے (۲) ضبطِ نفس یعنی اپنے نفس کی اصلاح کرے

غیر اللہ کے خوف و محبت سے بے نیاز ہو جائے اور خود غرضی اور نفسانیت وغیرہ
برائیوں سے بچے اور (۳) نیابتِ الٰہی۔ جب وہ ان دو منزلوں سے گذر جائے
انا اور اشرف المخلوقات کے شایانِ شان کام کرنے لگے گا تو وہ خدا کا خلیفہ
نائب ہو سکتا ہے۔ قرآن پاک میں آدم کا یہی مقام ہے۔

اقبالؔ سے پہلے انسانی نشو و نما کے لئے مختلف تحریکیں پیدا ہو چکی تھیں۔
افلاطون نے جمہوریت میں اعلیٰ سوسائٹی کی تشکیل کے لئے زور دیا تھا کہ اسی
طرح فرد کے لئے انصاف اور بھلائی کی راہیں کھل سکتی ہیں لیکن اقبالؔ اپنے
نظریے سے عملی اور زیادہ مستحکم سوسائٹی بنانا چاہتے ہیں اور وہ انسانِ کامل کی نشو و نما
چاہتے ہیں۔ THOMSON MORE (۱۴۷۸ء سے ۱۵۳۵ء) نے ETHOPIA
میں خیالی جنت بنائی تھی جو عملی زندگی سے دور تھی۔ عبد الکریم جیلیؔ نے بھی
ایک خیالی الانسان الکامل والا نظریہ پیش کیا تھا لیکن اس کی منزل کا صحیح
عملی راستہ نہیں تھا۔ نٹشے نے فوق البشر کا جو نظریہ پیش کیا تھا وہ صرف جسمانی
طاقت کا مظہر تھا اور اخلاق سے دور تھا۔ اقبالؔ نے اسلامی طریقہ پر نیابت الٰہی
اس انسانِ کامل کا نظریہ پیش کیا جس کی مثالیں صحابہ کرامؓ کی زندگیاں تھیں
یعنی قوت کے عقیدے سے غلامی کی زنجیریں کٹ جاتی ہیں۔ عقلیہ علم سے راہ کی
مشکلات کی بھیانک شکل نظر آتی ہے۔ لیکن عشق یا لگن کے سامنے یہ تمام مشکلات
ہیچ ہو جاتی ہیں۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

جب اس طرح فرد میں خودی اور خود شناسی پیدا ہو چکے گی تو اس پر یہ فرض عائد ہو گا کہ وہ جماعت میں ضم ہو جائے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

یہی چیز بے خودی ہے جو وحدت افکار و کردار سے ملت بنتی ہے اور یہی ملت دراصل انسان کو صحیح اخوت، مساوات اور حقیقی آزادی بخشتی ہے اس کے نزدیک نسل، رنگ، غریب، امیر وغیرہ کسی قسم کے امتیازات باقی نہیں رہتے یہ ہے مختصر بیان اقبال کے ان خیالات کا جو اس دور میں پیدا ہوئے تھے اور وہ مسلمان اور انسان کی نجات کے لئے یہی علاج ضروری سمجھتے تھے اس کے بعد ان کے کلام کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔

تیسرا دور

یہ دور ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک جس میں مسلمانوں کو بہت پریشانیاں اٹھانی پڑی تھیں اسی دور کے بعض حالات نے ہندو مسلمانوں کے درمیان خلیج زیادہ وسیع کر دی تھی اور یہ دونوں قومیں اپنی اپنی سیاست کے لئے بالکل مختلف طریقے اختیار کر چکی تھیں لیکن جو شورش پیدا ہو رہی تھی اس سے انگریز بھی چین سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے ۱۹۲۷ء میں "سائمن کمیشن" مقرر کیا کہ وہ یہ معلوم کرے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کہاں تک ہندوستان والوں کے لئے قابلِ عمل ہے اور ہندوستان کے لئے ذمہ دار حکومت کس طرح اور کن اصولوں پر قائم ہو سکتی ہے۔ یہ کمیشن ۱۹۲۹ء کے آخر میں ہندوستان آیا تو ہندو مسلمان پھر ایک بار متحد ہو کر انگریزوں کے مقابلے پر آئے۔ اس کا بائیکاٹ

کیا گیا۔ کیونکہ اس میں ہندوستانیوں کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اسی کے خلاف جناح کے ۱۴ نکات مشہور ہیں جن میں خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ان کی ۱/۳ نمائندگی اور جداگانہ انتخاب وغیرہ مقاصد شامل تھے۔ کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ ہندو غالب ہونے کی فکر میں تھے۔ آخر اس کمیشن نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستان کے اور ریاستوں کے نمائندے گول میز کانفرنس ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۲ء میں بلوائے جائیں۔ وہاں بھی جناح نے حالات کا جائزہ لیا اور مسلمانوں کے مفاد کو مدنظر رکھا۔ اس لئے وہاں سے واپس آکر انھوں نے مسلم لیگ کو پھر مضبوط بنانے کی کوشش کی۔ اور اقبال نے ۱۹۳۰ء میں مسلمانوں کے لئے ہندوستان میں ایک نیا گھر (پاکستان) بسانے کی تجویز پیش کی۔

اس دور میں اقبال نے یورپ والی قومیت کے خلاف ایک عالمگیر نظام پر غور کیا کیونکہ وہ قومیت محض رنگ نسل یا ملک کے رشتے والی تھی۔ اور اس کے برعکس اسلام میں اس قسم کا کوئی امتیاز نہیں ہے اس کے علاوہ اقبال نے سرمایہ دار اور مزدور کی جنگ میں نہ صرف مزدور کی حمایت کی بلکہ مسکینوں کا حق جتایا۔ کیونکہ قرآن پاک میں العفو (بقرہ) کا حکم آیا ہے یعنی خدا کی راہ میں وہ سب کچھ دے دو جو تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو۔

جو حرف "قل العفو" میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

اقبال نے اپنا پیام عام کرنے کے لئے پھر فارسی کی طرف توجہ کی ۱۹۲۳ء میں پیام مشرق ۱۹۲۶ء میں "زبور عجم" ۱۹۳۲ء میں "جاوید نامہ" ۱۹۳۳ء میں "مسافر" اسی مقصد سے فارسی میں لکھیں پھر ۱۹۳۵ء میں اپنی شاعری کی بہترین اردو تصنیف

"بالِ جبریل" شائع کی ۱۹۳۶ء میں اردو میں "ضربِ کلیم" اور فارسی میں مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" شائع کی یہ دونوں کتابیں مغربی تہذیب اور مغربی سیاست کے خلاف اعلان جنگ ہیں اس کا اکثر حصّہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق سے مزین ہے۔ کیونکہ وہ اسے مدینہ طیبہ لے جانا چاہتے تھے۔

اب ان کی شاعری پند و موعظت سے زیادہ تعلق رکھتی تھی تشبیہات و استعارات کم ہیں لیکن جذبات نگاری اور حقیقت نگاری زیادہ سے زیادہ غالب ہے اور ان کا سب سے بڑا دشمن مغربی تہذیب اور مغربی سیاست ہے وہ "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" منعقد کر کے مغربی سیاست کی دھجیاں اڑاتے ہیں۔

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ — مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے — بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

کیونکہ وہ سیاست لادینِ محض ہے۔ ع

کنیزِ اہرمن و دوں نہاد مُردہ ضمیر

وہ اشتراکیت، ملوکیت اور مغربی طرز کی جمہوریت کے سخت مخالف ہیں۔

جمہوریت اِک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

ایسی حکومت کا پریسیڈنٹ بھی جمہوریت کی آڑ میں ہمیشہ دوسروں کا سرمایہ ہڑپ کرتا رہتا ہے۔

اقبال کا نظریۂ شعر و ادب

غیر منقسم ہندوستان میں اسلام اور مسلمان کی تذلیل و تخریب کے لئے جو طاغوتی طاقتیں برسرِ پیکار ہوئیں ان کا سلسلہ عہد اکبری کے دینِ الٰہی سے شروع ہوتا ہے۔ کافرانہ اور ہندوانہ رسم و رواج کو فروغ ہوا۔ قشقہ، گاؤ نوازی، بادشاہ کا درشن، سورج کی پرستش، سرکاری شراب خانے کا قیام، خنزیر کی عظمت اذان میں رکاوٹ، مسجدوں کی بربادی، محمد اور احمد جیسے ناموں کی بے حرمتی اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی وغیرہ، بکثرت واقعات تاریخ بدایونی میں مذکور ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے شدت کے ساتھ ان چیزوں کی مخالفت کی اور اس زمانے کی سرکاری رویت ہلال کمیٹی سے متعلق ابو الفضل سے انھوں نے نہ صرف یہ کہا کہ "اکبر بے دین است" بلکہ ابو الفضل کی گستاخیوں کے خلاف رسالہ اثبات النبوۃ بھی لکھا۔ پھر یہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ ہی کا فیضان تھا کہ شاہجہاں اور اورنگ زیب جیسے متقی بادشاہ پیدا ہوئے فنِ مصوری جو عہدِ جہانگیر میں کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ فنِ خطاطی کی طرف منتقل

ہوا۔ فتاویٰ عالمگیری جیسی فقہ کی سب سے بڑی کتاب مرتب ہوئی اور حضرت ہی کے شاگردانِ سلسلہ یعنی حضرت شاہ ولی اللہؒ، حضرت میرزا مظہر جانجاناں سید احمد بریلوی، شاہ غلام علی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی (صاحب تفسیر مظہری)، خواجہ درد وغیرہ (رحمہم اللہ) اور ان کے متوسلین نے دین کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ اور یہ تحریک شیخ الہندؒ اور ان کے شاگرد عبید اللہ سندھی تک برابر جاری رہی۔ ع

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند

اقبال نے اس شعر میں اسی تحریک کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن اس تحریک کو کچلنے کے لئے "طاؤس و رباب" سے بھی کام لیا گیا ہے اور "ابلیس کی مجلس شوریٰ" بھی قائم کی گئی ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی مسلّم ہے لیکن انگریز کو اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ یہ قوم متحد ہونے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے چنانچہ ان کی قوت کو ختم کرنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے گئے۔ پادری فنڈر بلایا گیا۔ بریلوی، دیوبندی جھگڑے کھڑے کئے گئے۔ ایک پیغمبر نمودار ہوئے شدھی سنگھٹن تحریک قائم ہوئی اور کیا کچھ نہ ہوا۔ آپ خوب جانتے ہیں۔ سرسید کے رسالہ تہذیب الاخلاق کے مضامین تو کیا، صرف ان کے عنوانات ہی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ قوم میں کیا کیا برائیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ یا پیدا کرائی جا چکی تھیں پھر راعی اور رعایا کے درمیان مصالحت و مفاہمت اور دُرمَعَ الدّھر کَیفَ دار سرسید اور ان کے رفقاء کا خاص مقصد تھا لیکن علامہ اقبالؒ کے کام کی نوعیت مختلف تھی۔ وہ "بازمانہ ستیز" کے حامی تھے اور ابھی یورپ ہی میں تھے کہ انھوں نے

اسلامی حقائق کی اشاعت کو اپنا نصب العین بنالیا تھا وہ لکھتے ہیں کہ

"جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کئے ہیں۔ ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں ..... مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے" (اقبال نامہ حصہ اول ص ۱۱۰)

اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اور ایک ایسی حقیقت ہے۔ جس کے اختیار کئے بغیر ہماری زندگی زندگی نہیں رہتی۔ اس لئے اقبال نے اسلامی حقائق اور زندگی کے حقائق کو مترادف سمجھتے ہوئے بار بار کہا ہے کہ

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر — تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

انگریز نے ہمارے دین اور ہماری تہذیب کو مٹانے کے لئے جو حربے استعمال کئے تھے ان میں سب سے زیادہ خطرناک حربہ مغربی تہذیب ہے کیونکہ الناس علیٰ دین ملوکہم کے مصداق فاتح قوم کی ہر چیز اچھی سمجھی جاتی ہے اور محکوم قوم محض خوشامد کے لئے حاکم کی چیزوں کو اختیار کرنا چاہتی ہے۔ یہ احساسِ کمتری قوم کے لئے زہر قاتل ہے اور انگریز نے یہی زہر قاتل سب سے زیادہ استعمال کرایا ہے۔ چنانچہ ہماری قوم نے شعائر اسلامی کو پس پشت ڈال دیا۔ قرآن و حدیث کی نئی تاویلیں کیں بڑے بڑے عہدے ملتے ہی مسجدوں کو خیر باد کہا۔ اسلامی احکام پر عمل کرنے والے کو مُلا کہا اور علماء کی توہین کو اپنا شیوہ بنایا لیکن ٹھیک اس کے برعکس ہر قطعی حقیقت کو قرآنی صداقت نہیں کہا بلکہ GOSPEL TRUTH کہا اور عیسائی ملاؤں کو خوب جانتے پہچانتے ہوئے بھی پدر بزرگوار

(FATHER) ہمشیرۂ محترمہ (SISTER) کہا اور اب بھی کہا کرتے ہیں[1] اقبال نے مغربی تہذیب کی سخت مذمت کی اور شروع ہی سے اس کے خلاف نبرد آزمائی کی ہے۔ مثلاً

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ نہ سکی عفیف

اس تہذیب کی وجہ سے مسلمانوں میں جو احساسِ کمتری پیدا ہوا ہے اس کے متعلق کہتے ہیں۔

افرنگ زخود بے خبرت کرد وگرنہ
اے بندۂ مومن تو بشیری تو نذیری

پھر فرنگ نے جن لیڈروں اور علماء کو خرید لیا تھا ان کے متعلق بھی کہتے ہیں۔

مثالِ ماہ چمکتا تھا جس کا داغِ سجود
خرید لی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی

اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے دوسرا زہر قاتل، مغرب کا

---

[1] فرنگی تہذیب کی بعض چیزیں ایسی مقبول کر دی گئی ہیں کہ اب ان کا عیب بھی نہیں رہا صلیبی عقیدہ کی ٹائی (TIE) اب زینت کی چیز سمجھی جاتی ہے۔ اقبال نے خوب کہا ہے۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

جذبۂ وطنیت ہے۔ یہ جذبہ اسلام اور پاکستان دونوں کا دشمن ہے۔ پان اسلامزم کے خلاف یورپ نے جس وطنیت کے فساد کا بیج بویا ہے اور جس کا پودا اب زیادہ بڑھ رہا ہے اس کے متعلق اقبالؔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "اسلام کی پوزیشن سائنس کے خلاف نہایت مضبوط ہے۔ مگر اس کا دشمن یورپ کا کا نظریہ علاقائی وطنیت TERRITORIAL NATIONALISM ہے جس نے ترکوں کو خلافت کے خلاف اکسایا۔ مصر میں "مصر مصریوں کے لئے" کی آواز بلند کی اور ہندوستان کو پان انڈین ڈیموکریسی PAN-INDIAN DEMOCRACY کا بے معنی خواب دکھایا[۱]

بانگ درا میں بھی وہ کہہ چکے تھے

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر ۔۔۔ خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار ۔۔۔ قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری

مغرب نے تیسری قسم کا جو زہر استعمال کرایا وہ اس کی تعلیم ہے۔ اقبالؔ نے صاف کہا ہے کہ:۔

اور یہ اہل کلیسا کا نظامِ تعلیم ۔۔۔ ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

مکتب و مدرسہ جز درس نبودن نہ دہند ۔۔۔ بودن آموز کہ ہم باشی و ہم خواہی بود

دوسری جگہ کہتے ہیں۔

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے ۔۔۔ قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو ۔۔۔ خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

---

[۱] اقبال نامہ۔ ۲/۵۶۔

اور بالِ جبریل میں رومی کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے کہ

علم را بر تن زنی مارے بود | علم را بر دل زنی یارے بود

چوتھی مہلک چیز "تخمین و ظن" ہے جو یقین کی ضد اور احساس کمتری پستی، فروتنی، بے بضاعتی وغیرہ بیماریوں کی جڑ ہے۔ بڑی سے بڑی قوت یقین کے فقدان سے ختم ہو جاتی ہے اور معمولی سی چیز بھی اس پر غالب آجاتی ہے۔ چنانچہ ہر وہ علم، فلسفہ یا فکر جو صرف سوچنا سکھائے اور عمل کے لئے آمادہ نہ کر سکے وہ "تخمین و ظن" ہے اور سراپا حجاب بھی۔ اقبال کہتے ہیں۔

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن | عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن

بندۂ تخمین و ظن، کرم کتابی نہ بن | عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

ان خارجی مہلکات کے لئے چند چیزیں داخلی بھی ہیں جن سے قوم میں غفلت اور پستی پیدا ہوئی ہے اور وہ عجمی تصوف اور عجمی طرز کی شاعری ہے اقبال لکھتے ہیں

"عجمی تصوف سے لٹریچر میں دلفریبی اور حسن پیدا ہوتا ہے مگر ایسا کہ طبائع کو پست کرنے والا ہے۔ اسلامی تصوف دل میں قوت پیدا کرتا ہے اور اس قوت کا اثر لٹریچر پر ہوتا ہے میرا تو یہی عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کا لٹریچر تمام ممالک اسلامیہ میں قابلِ اصلاح ہے قنوطیت پسند ادب (PESSIMISTIC LITERATURE) کبھی زندہ نہیں رہ سکا، قوم کی زندگی کے لئے اس کا اور اس کے لٹریچر کا رجائیت پسند (OPTIMISTIC) ہونا ضروری ہے۔[1]

(۱) اقبال نامہ صفحہ ۵۵، ۵۶۔ ایک جگہ (اقبال نامہ ۱/۴۳) انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ صوفیوں کی تفسیر نے بھی پستی سکھائی ہے اور عربی محاورے کے خلاف قناعت اور توکل کے وہ معنی کئے ہیں جو عربی میں نہیں ہیں۔

اقبال نے ان تمام مہلکات اور خطرات کے خلاف معرکہ آرائی کی ہے اور اپنے آرٹ کے ذریعے قوم میں بیداری اور زندگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے یعنی شعر و ادب سے زندگی کے حقائق کی ترجمانی بھی کی ہے اور عمل کے لئے آمادہ بھی کیا ہے ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ:

"جذباتِ انسانی کی تخلیق یا بیداری کے کئی ذرائع ہیں جن میں سے ایک شعر بھی ہے اور شعر کا تخلیقی یا ایقاظی اثر محض اس کے مطالب و معانی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس میں شعر کی زبان اور زبان کے الفاظ کی صورت اور طرزِ ادا کو بھی بڑا دخل ہے"[1]

لیکن اقبال کے نزدیک صحیح شاعری وہی ہے جس میں قوت و شوکت کا پیام ہو اور جو قوم کو غفلت سے بیدار کر سکے[2]۔ جاوید نامہ میں کہتے ہیں۔

---

[1] اقبال نامہ صفحہ ۱۷۳۔ اقبال نامہ حصہ اول ص ۲۷۹ میں بلینک ورس کے زوال کی پیش گوئی کی ہے۔

[2] اقبال نے انسان کامل کا تصور بھی اسی مقصد کے لئے پیش کیا تھا اور وہ اس وقت جب کہ نیٹشے سے وہ واقف بھی نہیں تھے (اقبال نامہ حصہ اول ص ۴۵۸) یہ بھی حقیقت ہے کہ اسرارِ (خودی) کا فلسفہ مسلمان صوفیا اور حکما کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے۔ اور تو اور وقت کے متعلق برگسان کا عقیدہ بھی ہمارے صوفیوں کے لئے نئی چیز نہیں

(اقبال نامہ حصہ اول ص ۴۷۳)

اے بسا شاعر کہ از سحرِ ہنر | رہزنِ قلب ست و ابلیس نظر
شاعرِ ہندی خدایش یار باد | جانِ او بے لذتِ گفتار باد
شاعر اندر سینۂ ملت چو دل | ملتے بے شاعرے انبارِ گل
سوز و مستی نقشبند عالمے ست | شاعرے بے سوز و مستی ماتمے ست
شعر را مقصود اگر آدم گری ست | شاعری ہم وارثِ پیغمبری ست

اقبال نے نظری طور پر آرٹ کا جائزہ جس انداز سے لیا ہے اس کو خود ان کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے۔ ۱۹۱۷ء میں وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے نظری میلان کے باعث وجودی فلسفے کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلانِ طبیعت موجود تھا اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصے تک اس کا نشو و نما ہونے نہ دیا۔ تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا۔ یا با الفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بناء وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے۔ اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے۔[1]

---

[1] اقبال نامہ۔ حصہ اول صفحہ ۳۵، ۳۶۔

سی سال وہ ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ:

"میرا تو عقیدہ ہے کہ غلو فی الزہد اور مسئلہ وجود مسلمانوں میں زیادہ تر بدھ مذہب کے اثرات کا نتیجہ ہیں خواجہ نقشبندؒ اور مجددؒ سرہند کی میرے دل میں بہت عزت ہے۔ مگر افسوس کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ یہی حال سلسلۂ قادریہ کا ہے جس میں میں خود بیعت رکھتا ہوں۔ حالاں کہ حضرت محی الدینؒ (جیلانی) کا مقصود اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا تھا"۔ [1]

غلو فی الزہد اور وحدت الوجود کے علاوہ اقبال نے مسئلہ بروز کو بھی ایجاد کہا ہے۔ ایک خط میں وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ مسئلہ (بروز) عجمی مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اصل اس کی آرین ہے"۔ [2]

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ خالص اسلامی اندازِ پیش کرتے

---

1. اقبال نامہ حصہ اول ص ۷۸، ۷۹

2. ایضاً ص ۴۱۹۔ بروز کے ساتھ یہ اشعار بھی یاد رکھیں

وہ نبوت ہے مسلماں کیلئے برگِ حشیش | جس نبوت میں نہ ہو قوت و شوکت کا پیام

اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک | ہے جس کے تصور میں فقط بزمِ شبانہ

رہیں اس لئے اقبال کو ان سے خاص عقیدت ہے۔ ۱۹۱۵ء میں بھی وہ کہہ چکے تھے کہ مجددؒ الف ثانی، عالمگیر اور مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہم نے اسلامی سیرت کے احیاء کی کوشش کی مگر صوفیا کی کثرت اور صدیوں کی جمع شدہ قوت نے اس گروہِ احرار کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ ع

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر

(بالِ جبریل) والے اشعار بھی اسی عقیدت کے مظہر ہیں۔ بلکہ ۱۹۳۲ء میں[1] اقبال نے شیخ مجددؒ کے متعلق لندن میں تقریر بھی کی تھی[2] محض اسی بناء پر وہ بیدل کو پسند کرتے تھے شیخ محمد اکرام صاحب (غالب نامہ) کو لکھتے ہیں کہ:۔

"میرا ہمیشہ سے یہی خیال رہا ہے کہ حضرت غالب کو اردو نظم میں بیدل کی تقلید میں ناکامی ہوئی۔ غالب نے بیدل کے الفاظ کی نقالی ضرور کی۔ لیکن بیدل کے معانی سے اس کا دامن تہی رہا۔۔۔۔۔۔۔ ہند اور بیرونِ ہند کے معاصرین بیدل اور دوسرے دلدادگانِ نظم فارسی، بیدل کے نظریۂ حیات کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔"[3]

پھر ملفوظات میں صاف طور پر فرماتے ہیں:

"بیدل کے کلام میں خصوصیت کے ساتھ حرکت پر زور ہے

---

[1] اقبال نامہ۔ حصہ دوم ص ۴۸ — [2] ایضاً حصہ اول۔ ص ۲۴۲

[3] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۲۶

یہاں تک کہ اس کا معشوق بھی صاحب خرام ہے۔ اس کے برعکس
غالب کو زیادہ تر اطمینان و سکون سے الفت ہے۔۔ ۔۔ ۔۔
نقشبندی سلسلے اور حضرت مجدد الف ثانی سے بیدل کی عقیدت
کی بنیاد یہی ہے۔ نقشبندی مسلک، حرکت اور روحانیت
پر مبنی ہے" ؎۱

اسی لئے اقبال ایسے آرٹ کو پسند کرتے تھے جس میں جوش، ولولہ اور عمل کی تحریک ہو وہ لکھتے بھی ہیں کہ:

"شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا کہ
فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں۔ مقصود
صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔۔۔۔
کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔" ؎۲

اسرارِ خودی میں بھی انھوں نے کہا کہ

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست — بت پرستی بت گری مقصود نیست
حُسنِ اندازِ بیاں از من مجو — خوانسار و اصفہان از من مجو

اس مثنوی میں ایک فصل "حقیقتِ شعر" سے متعلق بھی ہے۔ اور سرورق پر رومی کا وہ قطعہ ہے جو "سخت کوشی" کی تعلیم دیتا ہے ؎

گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

؎۱ ملفوظات۔ مرتبہ محمود نظامی لاہور ص ۱۲۲۔ ؎۲ اقبال نامہ حصہ اوّل ص ۱۰۸

اقبال کی اردو شاعری پر جب نکتہ چیں حضرات نے لے دے کی تو انھیں انھیں کہنا پڑا۔

غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے؟ الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا

اسی وجہ سے انھوں نے بار بار اشعار کی معنویت اور حقیقت نگاری پر زور دیا ہے (اقبال نامہ، اوّل ۲۱۵ - ۲۷۰) اور اس بات کی پروا نہیں کی کہ کوئی انھیں شاعر سمجھے یا نہ سمجھے (دوم صفحہ ۴۰-۲۵۴) تاہم اقبالؔ نے اپنی شاعری کے لئے اچھی زبان اور اچھے اندازِ بیان کا لحاظ بھی رکھا ہے اور خصوصیت کے ساتھ پیامِ مشرق میں جو موسیقیت اور صوتی کشش موجود ہے وہ دوسرے شعرا کے یہاں بہت کم نظر آتی ہے۔ زبورِ عجم بھی اسی نوعیت کی ہے۔ بہر حال اقبالؔ کی خودی، بے خودی، عشق اور سخت کوشی وغیرہ[1] تمام تعلیمات کے لئے جس آرٹ کی ضرورت تھی وہ خونِ جگر کے بغیر تیار نہیں کیا گیا بلکہ انگریزی اور اُردو نثر میں بھی یہی رنگ ہے اور اُن کی زندگی اگر وفا کرتی اور قرآن و اسلام اور اس کے فقہ اجتہاد (اقبال نامہ حصہ اوّل صفحہ ۴۶ - ۳۵۷) پر بھی جو کچھ کہ وہ لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے لکھ سکتے تو اس کا رنگ بھی یہی ہوتا کیونکہ ان کا عقیدہ تھا

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

[1] سخت کوشی کے لئے یہ اشعار خوب ہیں۔

چیتے کا جگر چاہیئے شاہیں کا تجسس — جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانش و فرہنگ
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام — سخت کوشی ہے تلخِ زندگانی انگبیں

اور اس "خونِ جگر" میں گرمی اور جوش پیدا کرنے کے لیے اقبال کے پاس صرف ایک چیز تھی اور وہ تھا قرآن۔ رموزِ بے خودی کے آخر میں انھوں نے صاف طور پر اس چیز کا اقرار کیا ہے اور حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح خطاب کیا ہے

گر دلم آئینہ بے جوہر است — ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن — ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
تنگ کن رختِ حیات اندر برم — اہلِ ملت را نگہدار از شرم
خشک گرداں بادہ در انگورِ من — زہر ریزا اندر مے کافورِ من
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا — بے نصیب از بوسہ پا کن مرا
گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام — با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
عرض کن پیشِ خدائے عزّ وجل — عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل

اقبال
اور
حدیث

علامہ اقبال کی پرورش اور تربیت دینی ماحول میں ہوئی اس لئے شروع ہی سے قرآن اور حدیث سے شغف رہا۔ عربی بھی پڑھی اور فلسفے کو دین کا تابع بنا کر اپنے والد ماجد کی خواہش کے مطابق مسلمانوں کی خدمت کا بیڑا اٹھایا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت گویا ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اس لئے اُن کے کلام کے تمام مجموعوں میں احادیثِ مقدسہ کے انوار اور آثار پائے جاتے ہیں۔ فی الحال ان کی دو چھوٹی مثنویوں (اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی) کے سرسری مطالعے سے احادیث کو جمع کیا جاتا ہے٭ اللہ پاک کسی صاحب کو توفیق دے تو دوسرے مجموعوں میں سے اور راقم الحروف سے بہتر طریقے پر یہ خزینہ فراہم ہو سکتا ہے۔

ع بے تو بودن نتواں، با تو بنودن نتواں

احقر۔ غلام مصطفیٰ خان

٭۱۔ ابھی حکومت کے ایما پر راقم الحروف نے "اقبال اور قرآن" کتاب لکھی ہے

علم از سامانِ حفظِ زندگی ست — علم از اسبابِ تقویمِ خودی ست

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا ہے:۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْعِلْمِ لَایَنْفَعُ

= اے اللہ میں بے شک تیری پناہ چاہتا ہوں ایسے علم سے جس کا کوئی فائدہ نہ ہو (یعنی جو تیری رضا کے مطابق نہ ہو)

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش — تاجِ کسریٰ زیرپائے اُمتش

(۱) عن عمرؓ قال دخلت علیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاذا ھو مضطجع علی رمال حصیر لیس بینہ، فراش قد اثر الرمال بجنبہ۔

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُس وقت آپ کھجور کے پٹھوں کی چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ چٹائی کے اوپر کوئی فرش نہیں تھا۔ بوریے نے آپ کے پہلو پر نشان ڈال ڈال دیئے تھے۔

(۲) ایک حدیث ہے: ولئن طالت بک حیاۃ لتفحن کنوز کسریٰ۔ اگر تمہاری عمر طویل ہوئی تو تم کسریٰ کے خزانوں کو فتح کروگے (یہ پیشین گوئی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں پوری ہوئی)۔

در شبستانِ حرا خلوت گزید — قوم و آئین و حکومت آفرید

کان لایری رؤیا الاجاءت مثل فلق الصبح ثم حبب الیہ الخلاء وکان یخلو بغار حراء فیحنث فیہ (جمع الفوائد بحوالہ شیخین)

یعنی ابتدائے نزولِ وحی سے پہلے آپ کو خلوت محبوب تھی اور غارِ حرا میں

خلوت گزیں ہو جاتے تھے۔

آنکہ بر اعدا درِ رحمت کشاد　　مکّہ را پیغام لاتثریب داد

حدیث ہے: (۱) فتح مکّہ کے موقع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
الیوم یوم البر والوفاء، آج کا دن سلوک کرنے اور عطیات دینے کا دن ہو
پھر قریش سے فرمایا: (۲) اذھبوا فانتم الطلقاء لاتثریب علیکم الیوم۔
جاؤ، تم آزاد ہو اور تم پر آج کوئی مؤاخذہ نہیں

امتیازاتِ نسب را پاک سوخت
آتشِ او ایں خس و خاشاک سوخت

حجۃ الوداع کے مشہور خطبے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے
یہ الفاظ بھی ہیں۔

فلیس لعربی علیٰ عجمی فضل ولا لعجمی علیٰ عربی ولا لاسود علیٰ
ابیض ولا لابیض علیٰ اسود فضل الا بالتقویٰ

پس نہ کسی عرب کو عجمی پر فوقیت حاصل ہے۔ نہ کسی عجمی کو کسی عرب
پر، نہ کالا گورے سے افضل ہے، نہ گورا کالے سے۔ ہاں، بزرگی کا کوئی معیار
ہے تو وہ تقویٰ ہے

من چہ گویم از تولائیش کہ چیست
خشک چوبے در فراقِ او گریست

استنِ حنّانہ کی طرف اشارہ ہے۔

کان صلی اللہ علیہ وسلم اذا خطب یستند الی جذع نخلۃ من

سواري المسجد فلما صنع المنبر واستوى عليه اضطربت تلك السارية كحنين الناقة حتى سمعها اهل المسجد (جمع الفوائد بحوالۂ بخاری)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھجور کے ایک تنے کے سہارے خطبہ دیا کرتے تھے۔ جب آپ کے لئے منبر تیار کیا گیا اور اس پر چڑھ کر خطبہ دینے لگے تو وہ کھجور کا تنا مضطرب ہوگیا اور اونٹنی کے گریہ کی طرح گریہ و زاری کرنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کی آواز اہلِ مسجد نے بھی سُنی۔

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

حدیث: ما بینی بیتی ومنبری روضة من ریاض الجنة ومنبری علی حوضی (مشکوٰۃ)

میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان ایک باغ ہے جنت کے باغوں میں سے اور میرا منبر میرے حوض پر ہے۔

المدینة خیر لهم لو کانوا یعلمون (مشکوٰۃ)

مدینہ بہتر ہے ان کے لئے اگر انھیں معلوم ہو جائے۔

اند کے اندر حرائے دل نشیں   ترکِ خود کن سوئے حق ہجرت گزیں

یہ مضمون اس حدیث سے ماخوذ ہے

والمهاجر من هجر ما نهی الله عز وجل منه

اور خدا کی راہ میں ہجرت کرنے والا وہ شخص ہے جو خدا کی منع کی ہوئی چیزوں سے الگ ہو جاتا ہے۔

رزقِ خویش از نعمتِ دیگر مجو   موجِ آب از چشمۂ خاور مجو

مسلم شریف میں قبیصہ بن مخارق رضؓ سے روایت ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ المسئلۃ لا تحلُّ

بے شک سوال کرنا حلال نہیں (سوائے تین حالتوں کے انکی تفصیل حدیث میں آتی ہے)۔

ایک حدیث ہے ۔ لایزال الرجل یسئل الناس حتی یاتی یوم القیامۃ لیس فی وجھہ مضغۃ لحم

آدمی ہمیشہ لوگوں سے بھیک مانگتا رہے گا۔ یہاں تک کہ قیامت کے دن وہ اس حال میں آئے گا کہ اس کے منہ پر گوشت کی بوٹی نہ ہوگی۔

آنکہ خاشاکِ بتاں از کعبہ رُفت
مردِ کاسب را حبیب اللہ گفت

مشہور حدیث ہے:۔ الکاسب حبیب اللہ

کمانے والا، اللہ کا دوست ہے۔

باز گیر این عاملِ بدگوہرے
ورنہ بخشم ملکِ تو با دیگرے

رُبّ اشعث اغبر مدفوع بالابواب لو اقسم علی اللہ لابرّہ

(جمع الفوائد بحوالہ مسلم)

یعنی بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کے بال پریشان گرد آلود ہوتے ہیں اور دروازوں سے دھتکارے جاتے ہیں، اگر وہ اللہ پر کسی بات کی قسم

کھالیں تو وہ اُسے پورا کر دیتا ہے۔
(اس لئے ایسے لوگ اگر حاکموں کی تبدیلی بھی چاہیں تو اللہ تعالیٰ کر دیتا ہے)

نیشتر بر قلبِ درویشاں مزن
خویش را در آتشِ سوزاں مزن

ایک حدیث ہے:۔ انّما ینصر اللہ ہٰذہ الامّۃ بصعیفھا بدعواتھم وصلواتھم واخلاصھم (جمع الفوائد)
اللہ تعالیٰ اِس امّت کی مدد اس کے ضعیفوں کے ذریعے کرتا ہے اُن کی دعاؤں اور ان کی نمازوں اور ان کے اخلاص کی بدولت
(اس لئے ایسے صالحین کو ستانا ٹھیک نہیں)

قومہا از شکرِ او مسموم گشت
خفت واز ذوقِ عمل محروم گشت

افلاطون نے عالم اسباب کو محض افسانہ قرار دیا اور ع

گفت سرِّ زندگی در مُردن است

ایک حدیث میں ایسے گمراہوں کے تابعین کی مذمت ہے۔
لتركبنّ سُنَنَ مَن كانَ قبلكم حذوَ النّعلِ بالنّعلِ
تم ان لوگوں کے طریقوں کی پیروی کرو گے جو تم سے پہلے تھے جیسے ایک جوتی دوسری جوتی کے برابر کاٹی جاتی ہے۔

خوش نماید زشت را آئینہ اش
در جگر صد نشتر از نوشینہ اش

حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شعر پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ٹوکا کہ حرم اللہ میں تو شعر پڑھ رہا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عمر اس کو چھوڑ دو کہ:۔ فانہ، اشد علیھم من رشق النبل

پس وہ (شعر، ان (کافروں) کیلئے تیروں کے زخم سے زیادہ سخت ہے۔

شکوہ سنج سختیِ آئیں مشو
از حدودِ مصطفٰےؐ بیروں مشو

ارشاد ہے:۔ مَنْ كَانَتْ فَتْرَتُهٗ اِلٰی سُنَّتِیْ فَلَامٍ مَّاهُوَ

جو شخص حدیث پر ٹھہرے اس نے سیدھے راستے کا قصد کیا
(حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو اپنانا صحیح راستہ ہے)

مسلم اوّل شہ مرداں علیؓ
عشق را سرمایۂ ایماں علیؓ

حضرت علیؓ کے ایک شاگرد نے کہا: سمعت علیاً یقول انا اول من اسلم
میں نے علی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں پہلا شخص ہوں جو اسلام لایا۔

قال علیؓ والذی فلق الحبۃ وبراء النسمۃ انہ یعھد النبی الامی صلی اللہ علیہ وسلم الی ان لایحبنی الامومن ولایبغضنی الامنافق رواہ مسلم (مشکوٰۃ)

حضرت علیؓ نے فرمایا۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے دانہ پھاڑا (یعنی اُگایا) اور ذی روح کو پیدا کیا کہ نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو حکم دیا

اور یہ وصیت کی کہ مجھ سے (علیؓ سے) صرف وہ شخص محبت کرے گا جو مومن ہوگا اور مجھ سے وہ عداوت رکھے گا جو منافق ہوگا۔

ہر کہ در آفاق گرد بوتراب   باز گرداند ز مغرب آفتاب

ایک مرتبہ حضرت علیؓ کسی وجہ سے حضرت فاطمہؓ سے ناخوش ہوکر مسجد میں جاکر لیٹ گئے۔ ان کے جسم پر وہاں کی گرد لگ گئی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حالت میں دیکھ کر فرمایا، قُم یا ابا تُراب، قُم یا ابا تُراب (اٹھو اے ابوتراب، اٹھو اے ابوتراب) اس وقت سے حضرت علیؓ کی یہ کُنیت مشہور ہوگئی۔

دوسرے مصرع میں ایک ضعیف روایت کی طرف اشارہ ہے کہ ایک دفعہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے زانو پر سر رکھا نیند آگئی۔ نماز عصر کا وقت جارہا تھا۔ حضرت علیؓ نے نماز نہیں پڑھی تھی لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ حضور بیدار ہوئے تو پوچھا کہ تم نے نماز پڑھی؟ عرض کی کہ نہیں پڑھی۔ حضور نے دعا کی تو فوراً سورج واپس آگیا۔ (دیکھیں سیرۃ النبیؐ۔ جلد سوم۔ صفحہ ۷۹۷)

ذاتِ او دروازۂ شہرِ علوم   زیرِ فرمانش حجاز و چین و روم

حضرت علیؓ کے متعلق ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ انا مدینۃ العلم و علیٌ بابہا۔ میں علم کا شہر ہوں اور علی اسکا دروازہ

درعمل پوشیدہ مضمونِ حیات   لذتِ تخلیق قانونِ حیات

اس مضمون کے لئے مندرجہ ذیل حدیث سے استنباط کیا جاسکتا ہے۔

لَاخَیرَ فِیْ حَزمٍ بِغَیرِ عَزمٍ

بغیر عزم کے صرف ہوشیاری سے کوئی فائدہ نہیں۔

عفوِ بے جاسردیِ خونِ حیات — سکتۂ در بیتِ موزونِ حیات

حدیث ہے: من رای منکم منکراً فلیغیرہ بیدہٖ وان لم یستطع فبلسانہٖ وان لم یستطع فبقلبہٖ وذلک اضعف الایمان

تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو چاہیئے کہ اسے اپنے ہاتھ سے روک دے اور اگر ایسا نہ کر سکتا ہو تو اپنی زبان سے روک دے اور اگر ایسا بھی نہ کر سکتا ہو تو اپنے قلب سے (برا جانے) اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔

طبعِ مُسلم از محبت قاہر است — مسلم ار عاشق نباشد کافر است

حدیث ہے: لایؤمن احدکم حتّٰی اکون احب الیہ من والدہٖ وولدہٖ والناس اجمعین

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کیلئے اس کے باپ، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں

(مشکواۃ بحوالۂ صحیحین)

تاکجا در روز و شب باشی اسیر

رمزِ وقت از لی مع اللہ یاد گیر

حدیث ہے۔ لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ

میرے لیئے اللہ کے ساتھ ایک وقت ہوتا ہے۔

زندگی از دہر و دہر از زندگی ست

لاتسبّوا الدھر فرمانِ نبیؐ ست

حدیث ہے۔ لاتسبوا الدھر فان الدھر ھو اللہ
زمانے کو برا مت کہو اس لیے کہ اللہ ہی زمانہ ہے۔

جانم از صبر و سکوں محروم بود
وردِ من یا حَیُّ یا قیّوم بود

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بطور وصیت یہ وظیفہ (سکون کے لیے) عنایت فرمایا تھا۔

یَا حَیُّ یا قَیُّومُ برحمتک استغیثُ

اے ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والے خدا، میں تیری رحمت سے مدد چاہتا ہوں۔

ناتوانی، با جماعت یار باش — رونقِ ہنگامۂ احرار باش
حرزِ جاں کن گفتۂ خیر البشرؐ — ہست شیطان از جماعت دور تر

حدیث ہے۔ انّ الشیطان ذئب الانسان کذئب الغنم یاخذ الشاۃ والقاصیۃ والناحیۃ وایاکم والشعاب وعلیکم بالجماعۃ والعامۃ (رواہ احمد)

بے شک شیطان، آدمی کا بھیڑیا ہے جیسے بکری کا بھیڑیا ہوتا ہے جو اس بکری کو لے جاتا ہے جو ریوڑ سے بھاگ نکلی ہو یا ریوڑ سے دور چلی گئی ہو اور بچو تم پہاڑ کی گھاٹیوں (یعنی گمراہی) سے اور جماعت اور مجمع کے ساتھ رہو۔

ایک اور حدیث ہے۔ اتبعوا السواد الاعظم فانہ من شذَّ شُذَّ فی النار (ابن ماجہ)
جماعتِ کثیر کی پیروی کرو۔ پس جو شخص جماعت سے الگ ہو وہ آگ میں

تنہا ڈالا جائے گا۔

برنسب نازاں شدن نادانی است حکم او اندر تن و تن فانی است

حدیث ہے: قد اذہب عنکم عصبیۃ الجاہلیۃ و فخرہا بالآباء (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کی عصبیت اور باپوں پر فخر کو دور کردیا ہے (اب تو متقی مومن ہے یا فاجر بد بخت و بدکار، تمام آدمی آدمؑ کے بیٹے ہیں اور آدمؑ مٹی سے پیدا کیا گیا ہے)

حدیث ہے:- آتشِ قہرِ خدا سرمایہ اش

جنت الفردوس زیرِ سایہ اش

حدیث ہے۔ انّ ابواب الجنۃ تحت ظلال السیوف (جمع الفوائد بحوالہ مسلم)

بے شک جنّت کے دروازے تلواروں کے سایہ میں ہیں۔

لا نبیّ بعدی ز احسانِ خداست

پردۂ ناموسِ دینِ مصطفےٰؐ ست

لا نبیّ بعدی (میرے بعد اور کوئی نبی نہیں ہے) صحیحین کی مشہور حدیث ہے

بہر آں شہزادۂ خیر الملل

دوشِ ختم المرسلینؐ نعم الجمل

حضرت امام حسنین رضی اللہ عنہما کے لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

نعم الجمل جملکما و نعم العدلان انتما

۔ تم دونوں کی سواری سب سے عمدہ سواری ہے اور تم دونوں (سواری کیلئے) برابر کے سہارنے والے ہو۔

تیغ بہرِ عزتِ دین است و بس — مقصدِ او حفظِ آئین است و بس

حدیث ہے۔ من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ہی العلیا فہو فی سبیل اللہ

مجاہد وہی ہے جو اللہ کا بول بالا کرنے کے لئے جنگ کرے۔

حضرت کعب رضؓ اسلام لانے سے پہلے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخیاں کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اسلام لانے کے بعد بطور معذرت نامہ اپنا قصیدہ بانت سعاد پیش کیا اور اس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو "سیفٌ من سیوف الھند" کہا حضور نے اسے "سیف من سیوف اللہ" سے بدل دیا۔ یہی واقعہ علامہ اقبال نے یہاں نظم کیا ہے۔

پیشِ پیغمبر چو کعبِ پاک زاد — ہدیۂ آورد از بانت سعاد

در ثنایش گوہرِ شب تاب سُفت — سیفِ مسلول از سیوف الہند گفت

آں مقامش برتر از چرخ بلند — نامدش نسبت بہ اقلیمے پسند

گفت سیفٌ من سیوف اللہ گو — حق پرستی جز براہِ حق مپو

جلوۂ او قدسیاں را سینہ سوز

بود اندر آب و گلِ آدم ہنوز

ایک موضوع حدیث ہے۔ کُنتُ نبیا و ادم بین الماء والطین

میں نبی تھا اور آدم (ابھی) ماء اور طین (کی منزل میں) تھے۔

می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم — در دلِ او یاوہ گردد شام و روم

حجۃ الوداع کے خطبے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

فلیس لعربی علیٰ عجمی فضل ولا لعجمی علیٰ عربی ......

پس نہ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت حاصل ہے۔ نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر ...... (صفحہ ۲۱ میں بھی ذکر ہے)

نازِ بخششہائے آں سلطانِ دین   مسجدِ ما شد ہمہ روئے زمین

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

وجُعِلَت لِیَ الارضُ مسجداً وطھوراً ...

اور ساری زمین میرے لئے مسجد اور پاکیزہ بنادی گئی ہے۔

نوعِ انساں را پیامِ آخریں   حاملِ او رحمۃ للعالمین

قرآن ہی پیامِ آخریں ہے جس کے حامل حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان کے متعلق ہے کہ کانَ خُلقُہُ القرآن۔ اُن کا خلق قرآن ہے۔

زاجتہادِ عالمانِ کم نظر   اقتدار بر رفتگان محفوظ تر

یقبض العلم بقبض العلماء حتّٰی اذا لم یبق عالم اتخذ الناس رؤساءً جُھالاً فاسئلوا فافتوا بغیر علم فضلّوا واضلّوا

اللہ علم کو اس طرح اٹھائے گا کہ علماء کو اٹھائے گا۔ یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا پیشوا بنالیں گے۔ پس ان سے دین کی بات پوچھی جائے گی اور وہ علم کے بغیر فتویٰ دیں گے۔ پھر خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

اے صراطت مشکل از بے مرکبی   من چہ گویم چوں مرا پرسد نبیؐ

سمّنوا ضحایاکم فانھا علی الصراط مطایاکم

اپنی قربانی کے جانوروں کو موٹا کرو۔ یہ پل صراط پر تمہاری سواریاں ہونگی

آنکہ ناز د بر وجودش کائنات ذکرِ او فرمود با طیب وصلوات

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حبب الی (من الدنیا) الطیب والنساء وجعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ
(دنیا کی چیزوں میں سے) مجھے خوشبو اور بیویاں بہت بھاتی ہیں اور

نماز کو میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنایا گیا ہے (صفحہ ۱۲۰ میں بھی ایک شعر ہے)

گفت یا امت ز دنیائے شما دوست دارم طاعت وطیب و نسا

گفت آں مقصودِ حرفِ کن فکاں

زیر پائے امہات آمد جناں

حدیث ہے: الجنۃ تحت اقدام الامہات

جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔

آں امنّ الناس بر مولائے ما آں کلیمِ اوّلِ سینائے ما

حدیث ہے:۔ امنّ الناس علیّ فی صحبتہٖ ومالہٖ ابو بکر (صحیحین)
میری ذات کے حق میں رفاقت اور مال خرچ کرنے کے لحاظ سے سب

سے زیادہ (فیاض اور محسن) ابو بکرؓ تھے۔

ہمتِ او کشتِ ملت را چو ابر ثانیِ اسلام و غار و بدر و قبر

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے انتقال پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک لمبی تقریر

کی اس میں ایک جملہ یہ تھا۔ کنت اوّل القوم اسلاما واخلصھم ایمانا واشدھم یقینا
(بحوالہ ریاض النضرۃ)

یعنی اے صدیقؓ، مسلمانوں میں تم سب سے پہلے ایمان لائے، تمہارا ایمان سب سے زیادہ

خالص اور تمہارا یقین سب سے زیادہ محکم تھا۔ سورۃ التوبہ میں "ثانی اثنین" آیا ہے اور ترمذی میں ہے

عن ابن عمر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لابی بکر انت صاحبی فی الغار

حضرت ابو بکرؓ سے متعلق حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "تم غار (ثور) میں میرے ساتھی ہو۔

اقبال اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ اقبال کے جدِّ اعلیٰ، کشمیر میں بابا لولی حاجی کے نام سے مشہور مشائخ میں شمار ہوتے تھے جو بابا نصر الدینؒ (المتوفی ۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء) کے مرید تھے[1] والدین ماجدین اور استاد میر حسن کی تربیت سے علامہ کی ذہنی نشو و نما جس نہج پر ہوئی ہے، اس کی تفصیل مختلف کتابوں اور مقالوں میں موجود ہے۔ بچپن میں علامہ نے ایک پیشہ ور گدائے مبرم کی سرزنش کی تھی تو والد مرحوم[2] لرز گئے تھے۔ اور اس طرح بیٹے سے خطاب کیا تھا، جیسا کہ رموز بیخودی میں ہے۔

GIFT
Hamdard National Foundation
PAKISTAN

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھیے رسالہ "صحیفہ" لاہور۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء صفحہ ۱-۱۲

[2] ان کا انتقال ۱۷ر اگست سنہ ۱۹۳۰ء کو ہوا۔

اندکے اندیش و بیاد آور پسر | اجتماعِ امتِ خیرالبشر
باز ایں ریشِ سفیدِ من نگر | لرزۂ بیم و امیدِ من نگر
بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن | پیشِ مولا، بندہ را رسوا مکن
غنچۂ از شاخسارِ مصطفےٰ | گل شو از بادِ بہارِ مصطفےٰ
از بہارش رنگ و بو باید گرفت | بہرۂ از خلقِ او باید گرفت
فطرتِ مسلم سراپا شفقت است | در جہاں دست و زبانش رحمت است

والدہ مرحومہ کی تربیت سے جو فیض حاصل ہوا تھا، اس کا ذکر بھی علامہ نے اس طرح کیا ہے[1]

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا | گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات | تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

والدین ماجدین اور استاد کا ذکر "التجائے مسافر" میں بھی ہے:

پھر آ رکھوں قدم مادر و پدر پہ جبیں | کیا جنھوں نے محبت کا رازداں مجھکو
وہ شمعِ بارگاہِ خاندانِ مرتضوی | رہے گا مثلِ حرم جسکا آستاں مجھکو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی | بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھکو

---

[1] والدہ مرحومہ کا انتقال ۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو ہوا۔ رسالہ صحیفہ لاہور اکتوبر ۱۹۷۳ء صفحہ ۱۳۱ مکاتیب اقبال۔ حصہ دوم لاہور ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۱۱ میں اقبال اور ان کے والد صاحب کے متعلق دو واقعات ملتے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں۔

استاد مرحوم (المتوفی ۱۹۲۹ء) سے مستفیض ہونے کا زمانہ ایف اے کی
تعلیم کی تکمیل تک رہا۔ یہی زمانہ والدین سے زیادہ قریب رہنے کا بھی تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں۔

"جب میں ایف اے میں پڑھتا تھا تو صبح کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ والد صاحب مسجد سے نماز پڑھ کر آتے تو کبھی منزل ختم کر چکا ہوتا کبھی جاری رہتی۔ ایک دن آکر پوچھتے ہیں: "کیا پڑھتے تھے؟" مجھے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آگیا کہ چھ مہینے ہوگئے اور ہر روز دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم پڑھتا ہوں، پھر یہ سوال کیسا؟ نہایت نرمی سے فرمایا، میں پوچھتا ہوں کہ کچھ سمجھ بھی آجاتا ہے۔ اب میرا استعجاب اور غصہ جاتا رہا۔ اور کہا۔ کچھ عربی جانتا ہوں، کہیں کہیں سمجھ میں آجاتا ہے۔ بات ختم ہوگئی۔ کوئی چھ ماہ بعد، ایک دن لے کر بیٹھ گئے اور فرمایا، بیٹا، قرآن کریم اس کی سمجھ میں آسکتا ہے جس پر یہ نازل ہوتا ہے۔ میں حیران تھا کہ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن کریم کسی کی سمجھ میں آیا ہی نہیں۔ فرمایا، یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ قرآن کریم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کسی پر نازل ہی نہیں ہو سکتا۔ میں پھر حیران ہوا تو فرمایا، انسانیت کو جس معراج پر پہنچانا فطرت کا مقصود ہے اس کا نمونہ ہمارے سامنے محمد کی صورت میں پیش کر دیا گیا ہے۔ حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسیٰ تک ہر نبی محمد ہی کے مختلف مدارج تھے، وہ سلسلے گویا MUHAMMEDIN THE MAKING (تکمیل محمدؐ) کے منازل تھے۔ بنیادی اصول

ہر جگہ ایک تھا۔ البتہ شعورِ انسانی کے ارتقار کے ساتھ ساتھ فروعات کی تکمیل ہوتی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ محمدؐ مکمل ہوگیا۔ بابِ نبوت بند ہوگیا انسانیت اپنی معراجِ کبریٰ تک پہنچ گئی۔ اب ہر انسان کے سامنے معراجِ انسانیت کا نمونہ محمدؐ موجود ہے۔ کوئی انسان جتنا محمدیت کے رنگ میں رنگا جاتا ہے، اتنا ہی قرآن اس پہ نازل ہوتا جاتا ہے۔ یہ مفہوم تھا میرے کہنے کا۔ کہ قرآن کریم اس کی سمجھ میں آسکتا ہے جس پر نازل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ [1]

سیالکوٹ سے ۱۸۹۵ء میں ایف اے پاس کرکے لاہور آگئے، وہاں ۱۸۹۷ء میں بی۔اے اور ۱۸۹۹ء میں پروفیسر آرنلڈ کی تربیت میں ایم اے پاس کیا۔ پھر پروفیسر موصوف کی کشش نے انھیں انگلستان بلوالیا۔ [2] ڈاکٹری اور بیرسٹری کی سند لے کر ۱۹۰۸ء میں واپس آئے۔ [3] لیکن وہاں جانے سے پہلے اور واپسی پر حضرت نظام الدین اولیار رحمتہ اللہ علیہ

---

[1] رسالہ فکر و نظر (اسلام آباد۔ اگست ۱۹۷۶ء صفحہ ۱۱۹) والد صاحب کی مذکورہ بالا ہدایت کے پیشِ نظر علامہ اقبال نے بالِ جبریل میں فرمایا ہے:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب   گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف

[2] کیمبرج، لندن اور میونک یونی ورسٹیوں کا تذکرہ مختلف کتابوں میں موجود ہے

[3] انگلستان ۱۹۰۵ء میں موجود تھے۔ ۱۹۰۳ء میں نظم ابرِ گہربار" فریادِ امت" لکھی تھی۔ ۱۱ر مارچ ۱۹۰۳ء کے مکتوب میں اس کا ذکر ہے۔

کے آستانے پر دہلی میں حاضری دی۔ جس سے ظاہر ہے کہ انھیں اپنے والدین کے زیرِ تربیت اللہ والوں سے کس قدر عقیدت تھی۔ یورپ میں قیام کے زمانے میں علامہ اقبال نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہاں کے لوگ وطنیت اور قومیت کے نظریوں کے پردے میں کمزور قوموں کو ختم کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ جنگ بلقان اور جنگ طرابلس محض مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے کی گئی تھیں اس لئے علامہ اقبال نے شکوہ۔ جواب شکوہ۔ فاطمہ بنت عبداللہ اور حضور رسالت مآبؐ میں عنوان سے جو نظمیں لکھی ہیں۔ وہ مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ نظم شمع و شاعر بھی اسی جذبے کے تحت لکھی گئی ہے۔ جو فروری ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی۔ یہی وہ نظم ہے جس میں غالباً پہلی بار انھوں نے "بیخودی" اور "خودی" کے نظریے پیش کئے تھے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں — موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں
اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو — قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

پھر انھوں نے باقاعدہ اپنے مذکورہ نظریوں سے متعلق اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی مثنویاں شائع کیں۔ لکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا دونوں کتابیں ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئیں۔ لیکن وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ " جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر

۔ نظم شفاخانۂ حجاز میں اقبال آرزو کرتے ہیں

ع میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

۶ر اکتوبر ۱۹۱۱ء کو اکبر الہ آبادی کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: خدا آپ کو اور مجھکو زیارتِ روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نصیب کرے مدت سے یہ آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے۔ دیکھئے کب ن ہوتی ہے۔ ؎ مکاتیب اقبال حصہ دوم نمبر ۹۱

کئے ہیں۔ ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں[1]"

بہر حال اسرار خودی کے یہ اشعار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں جس انداز سے لکھے گئے ہیں۔ وہ اہلِ دل کے لئے متاعِ گرانمایہ ہیں:-

در دلِ مسلم مقامِ مصطفےٰ است　　آبروئے ما ز نامِ مصطفےٰ است
طور، موجے از غبار خانہ اش　　کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش
کمتر از آنے ز اوقاتش ابد　　کاسب افزائش از ذاتش ابد
بوریا ممنون خواب راحتش　　تاج کسریٰ زیر پائے امتش
در شبستانِ حرا خلوت گزید　　قوم و آئین و حکومت آفرید

رموز بیخودی میں بھی جگہ جگہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا ہے اور یہ کہ ۔

ہست دینِ مصطفےٰ دینِ حیات　　شرع او تفسیر آئینِ حیات

پھر اس مثنوی کے آخر میں عرضِ حال ہے ، جس میں انتہائی خلوص کے ساتھ عرض کرتے ہیں ۔

اے ظہور تو شباب زندگی　　جلوہ ات تعبیر خواب زندگی
اے زمیں از بارگاہت ارجمند　　آسماں از بوسۂ بامت بلند
شش جہت روشن زتاب روئے تو　　ترک و تاجیک و عرب ہندوئے تو
از تو بالا پایہ ایں کائنات　　فقر تو سرمایۂ ایں کائنات
در جہاں شمع حیات افروختی　　بندگاں را خواجگی آموختی

[1] ۔ مکاتیب اقبال ۔ حصہ اول ۔ ۵۱

اس نعت کے بعد قوم کے متعلق کہتے ہیں۔

محفل از شمعِ نوا افروختم — قوم را رمزِ حیات آموختم

لیکن پھر عرض پرداز ہیں:

اے بصیری را ردا بخشندۂ — بربطِ سلمیٰ مرا بخشندۂ
ذوقِ حق دہ ایں خطا اندیش را — ایں کہ نشناسد متاعِ خویش را
گر دلم آئینۂ بے جوہر است — ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
اے فروغت صبحِ اعصار و دہور — چشمِ تو بینندۂ ما فی الصدور
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن — ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
تنگ کن رختِ حیات اندر برم — اہلِ ملت را نگہدار از شرم
سبز کشتِ نابسامانم مکن — بہرہ گیر از ابرِ نیسانم مکن
خشک گرداں بادہ در انگورِ من — زہر ریز اندر مئے کافورِ من
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا — بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

اللہ اللہ کتنا خلوص ہے۔! ایسے خلوص کی مثالیں اہل اللہ کے یہاں بھی اکثر کم یاب ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔

اس کے بعد پھر عرض کرتے ہیں

گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام — با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
اے کہ از احسانِ تو ناکس کس است — یک دعایت مزدِ گفتارم بس است
عرض کن پیشِ خدائے عزوجل — عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل

پھر ایک اور آرزو پیش کرتے ہیں:-

رخت جاں تا درجہاں آوردہ ام — آرزوئے دیگرے پروردہ ام
ہمچو دل در سینہ ام آسودہ است — محرم از صبحِ حیاتم بودہ است

اپنے والد صاحب کے فیضان کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ

از پدر تا نام تو آموختم — آتشِ ایں آرزو افروختم
تا فلک دیرینہ تر سازد مرا — در قمارِ زندگی بازد مرا
آرزوئے من جواں تر می شود — ایں کہن صہبا گراں تر می شود
ایں تمنا زیرِ خاکم گوہر است — در شبم تاب ہمیں یک اختر است

اس آرزو کا ذکر بعد میں کریں گے۔ ابھی خود اپنے گذشتہ حالات بھی بے کم و کاست عرض کرنا چاہتے ہیں کہ :۔

مدتے با لالہ رویاں ساختم — عشق با مرغولہ مویاں باختم
بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم — بر چراغِ عافیت داماں زدم
عقل آذر پیشہ ام زنار بست — نقش او در کشورِ جانم نشست
سالہا بودم گرفتارِ شکے — از دماغِ خشکِ من لا ینفکے
حرفے از علم الیقیں ناخواندہ — در گمانِ آبادِ حکمت ماندہ
ظلمتم از تابِ حق بیگانہ بود — شامم از نورِ شفق بیگانہ بود

اس کے بعد پھر اپنی آرزو کا ذکر کرتے ہیں :۔

ایں تمنا در دلم خوابیدہ ماند — در صدف مثلِ گہر پوشیدہ ماند
آخر از پیمانۂ چشمم چکید — در ضمیرِ من نوا ہا آفرید
اے ز یادِ غیر تو جانم تہی — بر لبش آرم اگر فرماں دہی

زندگی را از عمل ساماں نمود　　پس مرا ایں آرزو شایاں نبود

شرم از اظہار او آید مرا　　شفقتِ تو جرأت افزا ید مرا

ہست شان رحمتت گیتی نواز　　آرزو دارم کہ میرم در حجاز

پھر بہت ڈرتے ڈرتے ہوئے اس آرزو کا اظہار کرتے ہیں، جس کا ذکر انھوں نے نظم "شفاخانۂ حجاز" میں پہلے بھی کیا تھا کہ:

میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں[1]

اور یہ آرزو یقیناً موجبِ افتخار و ابتہاج ہے کہ :

با فلک گویم کہ آرامم نگر　　دیدۂ آغازم، انجامم نگر

یہاں یہ عرض کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی رموزِ بیخودی کن حالات میں لکھی گئی۔ علامہ اقبال ۴ر اکتوبر ۱۹۱۵ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض وغایت سے آشنائی نہیں، ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین

---

[1] ایک حدیث کی رو سے یہ بات حقیقت بن جاتی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے جس قدر زیادہ عقیدت ہوگی، اسی قدر حضورؐ کا قرب زیادہ حاصل ہوگا۔ سحر خیزی سے بھی یہ محبت حاصل ہوتی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی سحر خیزی کا ذکر ۱۳ر اکتوبر ۱۹۱۶ء کے مکتوب میں کیا ہے

دیکھیں مکاتیب حصہ دوم نمبر ۶۵۔

بھی [1] ایرانی ۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں، جس کی اشاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے ہوئی ۔ صوفی لوگوں نے اسے تصوف پر ایک حملہ تصور کیا ہے اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے ۔ انشاءاللہ دوسرے حصے میں (رموز بیخودی) میں) دکھاؤں گا کہ تصوف کیا ہے، اور کہاں سے آیا اور صحابۂ کرام کی زندگی سے کہاں تک ان تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے ۔ جس کا تصوف حامی ہے [2]

مسلمانوں کی بے حسی اور انحطاط کے اسباب وعلل کا ذکر کئی جگہ علامہ نے کیا ہے [3]

---

[1] ۔ اسی قسم کے خیالات کا اظہار اکبر الہ آبادی کے نام ایک مکتوب میں بھی ہے ۔ دیکھیں مکاتیبِ اقبال حصہ دوم نمبر ۲۱-۲۲

[2] ۔ ۱۹ر جولائی ۱۹۱۶ء کے ایک مکتوب میں بھی اس طرف اشارہ ہے، فرماتے ہیں "اسطرح ان لوگوں نے نہایت بے دردی سے قرآن اور اسلام میں ہندی اور یونانی تخیلات داخل کر دیے ہیں، کاش مولانا نظامی کی دعا اس زمانے میں مقبول ہو۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر تشریف لائیں اور ہندی مسلمانوں پر اپنا دین بے نقاب کریں۔"

[3] "جس قوم میں طاقت وتوانائی مفقود ہو جائے، جیساکہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہوگئی، تو پھر اس قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے ۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین وجمیل شے ہو جاتی ہے اور ترک دنیا موجب تسکین ۔ اس ترک دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی وکاہلی اور اس شکست کو جوان کے تنازع للبقا میں ہو چھپایا کرتی ہیں خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کی ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا"

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کا ذکر ۱ر جولائی ۱۹۱۶ء کے ایک مکتوب میں اِس طرح ہے :-

" حدیث میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ افسوس ہے مسلمان مردہ ہیں، انحطاط ملّی نے ان کے تمام قویٰ کو شل کر کے رکھدیا ہے۔ اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے، جس سے انحطاط کا مسحور اپنے قاتل کو اپنا مربی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔ مگر ہمیں ادائے غرض سے کام ہے۔ ملامت کا خوف رکھنا ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ میں مثنوی اسرارِ خودی کا دوسرا حصہ لکھ رہا ہوں۔ امید ہے اس حصے میں بعض باتوں پر مزید روشنی پڑے گی .... حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل وشعار میں باطنی معانی تلاش کرنا۔ یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت SUBTLE (لطیف) طریقِ تنسیخ کا ہے۔ اور یہ طریق وہی قومیں اختراع یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفے کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلانِ طبیعت موجود تھا اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشو و نما نہ ہونے دیا۔ تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا۔ یا بالفاظ دگر مسلمانوں

میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے۔ اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے ۔۔۔۔"

اگر علامہ اقبال کے اس نظریے کے مطابق ہمارے شعراء کا مطالعہ کیا ——— جائے تو واقعی عجیب و غریب باتیں ظاہر ہوں گی۔ قوم اور ملت کا درد دراصل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے حد درجہ محبت اور عقیدت کی وجہ سے تھا۔ اسی لئے سیرتِ طیبہ کا مطالعہ علامہ اقبال کا محبوب مشغلہ تھا۔ ۲ر اکتوبر ۱۹۱۸ء کو مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"...... معنوی طور پر آپ کی صحبت رہی، کیونکہ رات کو سیرۃ النبیؐ کا مطالعہ رہتا تھا۔ مولانا (شبلیؒ) مرحوم نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیاہے، جس کا صلہ دربارِ نبویؐ سے عطا ہوگا۔"

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس عقیدت کا ذکر مولانا غلام قادر گرامی کے نام ۱۲ر اکتوبر ۱۹۱۸ء کے ایک مکتوب میں اس طرح ہے۔

" مسلم کو موت نہیں چھو سکتی کہ اس کی قوت، حیات و موت کو اپنے اندر جذب کرکے حیات و ممات کا تناقص مٹا چکی ہے۔ شاید نفیر نامی ایک شخص تھا جو پہلے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سخت ایذا دیتا تھا۔ فتح مکہ کے بعد جب حضور شہر میں داخل ہوئے تو ایک مجمع عام میں آپؐ نے علی مرتضیٰ رضؓ کو حکم دیا کہ اس کی گردن اڑا دو۔ ذوالفقار حیدری نے

ایک آن میں اس کم بخت کا خاتمہ کردیا۔ اس کی لاش خاک و خون میں تڑپ رہی تھی، لیکن وہ ہستی جس کی آنکھوں میں دوشیزہ لڑکیوں سے بھی زیادہ حیا تھی، اور جس کا قلب تاثراتِ لطیفہ کا سرچشمہ تھا، اس دردانگیز منظر سے مطلق متاثر نہ ہوئی۔ نضیر کی بیٹی نے باپ کے قتل کی خبر سنی تو وہ نوحہ و فریاد کرتی اور باپ کی جدائی میں دردانگیز اشعار پڑھتی ہوئی، دربارِ نبوی میں حاضر ہوئی، اللہ اکبر! اشعار سنے تو حضورؐ اس قدر متاثر ہوئے کہ اس لڑکی کے ساتھ مل کر رونے لگے۔ یہاں تک کہ جوشِ ہمدردی نے اس سب سے زیادہ ضبط کرنے والے انسان کے سینے سے ایک آہ سرد نکلوا کر چھوڑی۔ پھر نضیر کی تڑپتی ہوئی لاش کی طرف اشارہ کرکے فرمایا یہ فعل محمد رسول اللہ کا ہے۔ اور اپنی روتی ہوئی آنکھ پر انگلی رکھ کر کہا۔ یہ فعل محمد بن عبداللہ کا ہے۔ پھر حکم دیا کہ نضیر کے بعد کوئی شخص مکہ میں قتل نہ کیا جائے۔

غرض کہ اسی طرح مسلم حنیف، جذباتِ متناقض یعنی قہر و محبت اپنے قلب کی گرمی سے تحلیل کرلیتا ہے اور اس کا دائرۂ اثر اخلاقی تناقضات تک ہی محدود نہیں بلکہ تمام طبعی تناقضات پر حاوی ہے۔ پھر مسلم جو حامل ہے 'محمدیت' کا اور وارث ہے موسویت کا، اور ابراہیمیت کا' کیونکر کسی شے میں جذب ہوسکتا ہے؟ البتہ اس زمان و مکان کی مقید دنیا کے مرکز میں ایک ریگستان ہے جو مسلم کو جذب کرسکتا ہے اور اس کی قوتِ جاذبہ ذوقی اور فطری نہیں بلکہ مستعار ہے۔ ایک کفِ پا سے

جس نے اس ریگستان کے چمکتے ذروں کو کبھی پامال کیا تھا۔"

اسی انداز سے علامہ اقبال نے ایک جگہ اور بھی فرمایا ہے:۔

"البتہ ایک ہستی ضرور ایسی گذری ہے، جس نے خود ہی ایک نظریہ پیش کیا اور خود ہی اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ جانتے ہو وہ کون تھا؟ وہ محمد عربیؐ تھا، یا پھر موسیٰ علیہ السلام [1]

یہ بات بھی محض حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی عقیدت کی وجہ سے تھی کہ وہ مولانا سلیمان ندوی کے نام ۲ر دسمبر ۱۹۱۸ء کو لکھتے ہیں:

"آپ امت محمدیہ کے خاص افراد میں سے ہیں اور اس لئے مامور من اللہ قوم کے خاص افراد کو ہی امر الٰہی ودیعت کیا گیا ہے۔ فرقہ یاسیہ کو چھوڑ کر فرقہ رجائیہ میں آ جائیے۔ جس حقیقت کو آپ زیرِ پردہ دیکھ چکے ہیں اس کی بے نقابی کا زمانہ قریب ہے۔ انشاء اللہ"

اس رجائیت کا ذکر علامہ اقبال نے اپنی نظم طلوع اسلام کے آخر میں کیا تھا:۔

کنارا ز زاہداں برگیر و بیباکانہ ساغر کش

پس از مدت ازیں شاخ کہن بانگ ہزار آمد

بہ مشتاقاں حدیث خواجۂ بدر و حنین آور

تصرفہائے پنہانش بچشم آشکار آمد

دگر شاخ خلیلؑ از خون ما نمناک می گردد

ببازار محبت نقد ما کامل عیار آمد

---

[1] دیکھیں مکاتیب اقبال۔ حصہ اول نمبر ۱۲

پھر اپریل ۱۹۲۲ء تک پیامِ مشرق چھپ گئی ہوگی اور اس پر غالباً ماہ جون کے رسالۂ معارف (اعظم گڑھ) میں مولانا سلیمان ندوی کا تبصرہ شائع ہوا تھا، علامہ اقبال نے اس کا شکریہ ادا کیا ہے۔ [1]

پیامِ مشرق میں علامہ نے اپنی کشمیری نسبت کے ساتھ حجازی دل کا ذکر بھی کیا ہے۔

تنم گلے ز خیابانِ جنتِ کشمیر
دل از حریمِ حجاز و نوا ز شیراز است

اس کتاب میں بھی انھوں نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس طرح عرض کیا ہے۔

با خدا در پردہ گویم، با تو گویم آشکار
یا رسول اللہ، او پنہان و تو پیدائے من

اور "خطاب بہ مصطفیٰ کمال پاشا" والی نظم میں کہا ہے۔

ایمۂ بود کہ ما ز اثرِ حکمتِ او — واقف از سرِ نہان خانۂ تقدیر شدیم
اصلِ ما یک شرر باختہ رنگے بودہ است — نظرے کرد کہ خورشید جہانگیر شدیم

اور شروع میں میر امان اللہ خان کے لئے جو اشعار ہیں، ان میں یہ شعر کس قدر

---

[1] دیکھیں مکاتیب اقبال حصہ اول۔ نمبر ۱۲۴ ص ۵۸۔ لیکن حصہ دوم کے مکتوب ۷۹ میں جو ۱۹ مارچ ۱۹۲۳ء کو لکھا گیا، پیامِ مشرق کے جلد شائع ہونے کی یہ اطلاع ہے کہ ابھی طباعت ہو رہی ہے۔

رفعت اور سربلندی کا پیام ہے۔

ہر کہ عشق مصطفےٰؐ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست [1]

ہم اوپر نظم طلوعِ اسلام کا ذکر کر چکے ہیں [2] وہ ۱۹۲۳ء میں لکھی گئی جبکہ مصطفیٰ کمال نے ترکوں کو آزاد کرایا تھا۔ وہ نظم بانگ درا میں شامل ہے جو ستمبر ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں بھی جگہ جگہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت کا اظہار ہے۔ غزلوں میں سے چند اشعار یہ ہیں:۔

کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغِ سکندری

اے بادِ صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضہ سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا، دنیا بھی گئی

---

[1] جواب شکوہ میں بھی ہے:۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

[2] یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو علامہ اقبال کو "سر" کا خطاب ملا تھا۔ ۲۰ جنوری کے ایک مکتوب میں (اس خیال سے کہ اب کوئی انھیں حکومت کا بندہ نہ سمجھے) لکھتے ہیں۔
"قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضے میں میری جان اور آبرو (بقیہ بر صفحۂ آئندہ)

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدہ زخمہ ہائے عجم رہا

وہ شہید ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

بانگ درا کی اکثر نظموں میں بھی یہی عقیدت نظر آتی ہے۔ "بلادِ اسلامیہ" "ترانۂ ملی" "وطنیت" "ایک حاجی مدینے کے راستے میں"، "خطاب بہ جوانانِ اسلام" وغیرہ دیکھیے۔ پھر "حضورِ رسالتمآب میں" میں عرض کرتے ہیں۔

حضور! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

پھر زبورِ عجم ۱۹۲۶ء میں مکمل ہوئی اور دوسرے سال شائع ہوئی، اس میں بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے نورِ عین حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی حیاتِ طیبہ سے روشِ عمل حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ گذشتہ) ہے اور قسم ہے اس بزرگ و برتر کی جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی انشاء اللہ۔ اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں لیکن اس کا دل مومن ہے:

پھر ۱۴ر جنوری ۱۹۲۳ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔ "میرا عقیدہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں اور اس زمانے کے لوگ بھی اسی طرح مستفیض ہو سکتے ہیں جس طرح صحابہؓ ہوا کرتے تھے۔

ریگِ عراق منتظر کشتِ حجاز تشنہ کام
خونِ حسینؓ بازدہ کوفہ و شام خویش را[1]

ایک جگہ یوں بھی عرض کرتے ہیں۔

حکمت و فلسفہ کردہ است گراں خیز مرا
خضرِ من، از سرم ایں بارگراں پاک انداز

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت بڑی مصلحت رکھتی ہے

مصطفیٰ از کعبہ ہجرت کردہ با ام الکتاب

پھر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سیرتِ مبارکہ ہے، جس سے "بے ہمہ" اور "با ہمہ" کا درس ملتا ہے۔

زندگی انجمن آرا و نگہدار خود است
اے کہ در قافلۂ بے ہمہ شو با ہمہ رو

اس کے بعد علامہ اقبال الٰہیاتِ اسلامیہ والے انگریزی خطبات کی تیاری میں مصروف رہے۔ گو کہ زبورِ عجم کی ترتیب کے وقت وہ کونسل کے ممبر بھی منتخب ہو چکے تھے[2]

---

[1] بالِ جبریل میں بھی ہے :۔

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

[2] غالباً اسی زمانے میں علامہ اقبال نے ڈاکٹر نکلسن کو وہ طویل مکتوب لکھا ہے جو مکاتیب حصۂ اول کے آخر میں ہے۔

اور سیاسی خدمات میں بھی پیش پیش تھے۔

انگریزی خطبات گو کہ علامہ اقبال نے ۱۹۲۸ء سے لکھنے شروع کیے لیکن بہت پہلے سے یہ کام ان کے ذہن میں تھا۔ مولانا سلیمان ندوی کے نام ان کے جو مکاتیب ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۹۲۲ء سے ان کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔ یہ مکاتیب ۶۰ تا ۶۶ ـ ۶۸ تا ۷۴ ـ ۷۶ تا ۷۸ ـ ۸۰ ـ ۸۲ ـ ۸۹ ـ ۹۱ ہیں۔ جن میں ان مسائل سے متعلق استفسارات ہیں جن کا ذکر ان خطبات میں آتا ہے۔ ان مکاتیب کی مدت تحریر ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۳ء تک ہے۔ گو کہ وہ شروع کے چھ خطبات ۱۹۳۰ء[1] تک تیار کر چکے تھے۔

مکتوب نمبر ۱۰۶ حصہ اول میں ۵ر دسمبر ۱۹۲۸ء کو لکھتے ہیں

"تین لیکچر امسال لکھے گئے ہیں۔ تین آئندہ سال لکھوں گا اور مدراس ہی میں دسمبر ۱۹۲۹ء یا جنوری ۱۹۳۰ء میں دوں گا۔ حیدر آباد دکن بھی ٹھہروں گا۔ کیونکہ عثمانیہ یونیورسٹی کا تار آیا ہے کہ لیکچر وہاں بھی دیے جائیں۔"

علامہ اقبال نے یہ لیکچر مدراس، حیدر آباد اور علی گڑھ میں دیے۔ لیکن ان سے متعلق ان کا مطالعہ جاری رہا۔ چنانچہ ساتواں لیکچر (کیا مذہب کا امکان ہے؟) (IS RELIGION POSSIBLE?) انھوں نے لندن ARISTOTLIAN SOCIETY کے لئے تیار کیا تھا۔ جس کی تکمیل کا ذکر ۲۹ر مئی ۱۹۳۲ء کے مکتوب (نمبر ۱۲۳، حصہ دوم) میں ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے بعد بھی اس میں ترمیم و اضافہ کیا گیا ہو۔ لیکچروں (خطبات) کی

---

[1] مکتوب نمبر ۴۶ (حصہ اول) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انگریزی خطبات ۲۰ مئی ۱۹۳۰ء سے پہلے شائع ہو چکے تھے۔

کے مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے مکتوب نمبر ۱۹ (حصہ اول) بھی بڑی مناسبت رکھتا ہے جو ۲ستمبر ۱۹۲۵ء کو لکھا گیا تھا۔

"...... کیا اچھا ہو کہ وہ (مولوی صاحب) شریعتِ محمدیہ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں جس میں عبادت و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو۔ معاملات کے متعلق خاص طور پر ۔۔ ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے رسالہ 'بلاغ' امرتسر کے ہر نمبر میں اور مولوی حشمت علی صاحب کے رسالہ اشاعۃ القرآن کے ہر نمبر میں اسی پر بحث ہوتی ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے۔ کہ سیادت انسانی کے لیے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں۔ اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص موضرالذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت مروج ہیں ان پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے لیے[1] اصول فقہ JURISPRUDENCE پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا۔ وہ اسلام کا مجدد ہوگا۔ اور یہی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔"

---

[1] یہی بات مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ۸ مارچ ۱۹۲۶ء اور ۷ اپریل ۱۹۲۶ء کے مکاتیب میں بھی ہے۔

پھر شرعی تقاضوں اور حالاتِ حاضرہ سے متعلق علامہ اقبال نے اس طرح اظہارِ خیال کیا۔

"شارعِ اُمّی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وہ اصول بتائے ہیں کہ ان کی ہمہ گیری کے سامنے حال کے مغربی فقہاء کا تفقہ، جس پر ہمارے وکیلوں اور بیرسٹروں کو ناز ہے۔ ایک طفلِ مکتب کی ابجد خوانی معلوم ہوتی ہے۔

رسالتِ محمدیہ کا مقصد صرف یہی نہیں کہ بندوں کو اپنے رب سے ملائے، بلکہ اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ بندوں کو چار عناصر کی دنیا میں رہنے اور انفرادی اور ملی زندگی بسر کرنے کے لئے ایک مکمل آئین بھی تیار فرمائے اور یہ آئین خدائے تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس وقت تک مسلمانوں کے پاس ہے۔ اس سے مستفید ہونے کے لئے قوتِ استدلال اور پاکیزگیٔ عمل کی ضرورت ہے۔ اور ان اوصاف کی متاعِ گراں بہا ابھی تک بکلی مفقود نہیں ہوئی۔ ..... ان مسلمانوں کو اپنے ہر فعل کے لئے (خواہ انفرادی ہو خواہ اجتماعی) کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں نظام کار تلاش کرنا چاہیئے۔ اور جو نظامِ کار ان دو ماخذوں سے ملے اسی پر عمل پیرا ہونا چاہیئے" [۱]

یہی وہ زمانہ تھا کہ جب علامہ اقبال سیاست کے میدان میں داخل ہوئے تھے۔ وہ ۱۹۲۶ء میں کونسل کے ممبر ہوئے اور ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو مسلم لیگ کے اجلاس

---

[۱] رسالہ صحیفہ لاہور۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء صفحہ ۲۳۸

منعقدہ الہ آباد میں صدر کی حیثیت سے اپنے خطبے میں مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن (پاکستان) کا مطالبہ کیا۔ پھر آپ ایک دوسری گول میز کانفرنس (لندن) کے ممبر منتخب ہوئے یہ کانفرنس ۷ ستمبر ۱۹۳۱ء سے شروع ہو کر یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو ختم ہوئی۔ واپسی میں اٹلی اور اسپین وغیرہ کی بھی سیر کی۔ غالباً الہ آباد کے اجلاس (۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء) کے زمانے میں یا اس سے پہلے علامہ اقبال نے ایک خواب دیکھا تھا۔ راغب احسن صاحب کے نام ایک مکتوب مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۱ء میں لکھتے ہیں

"مدت ہوئی میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک سیاہ پوش فوج عربی گھوڑوں پر سوار ہے۔ مجھے تفہیم ہوئی کہ یہ ملائکہ ہیں۔ میرے نزدیک اس کی تعبیر یہ ہے کہ ممالکِ اسلامیہ میں کوئی جدید تحریک پیدا ہونے والی ہے۔ عربی گھوڑوں سے مراد روح اسلامیت ہے" [1]

۱۹۳۰ء ہی میں علامہ اقبال جاوید نامہ شروع کر چکے ہوں گے۔ ۲۰ جنوری ۱۹۳۱ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"آخری نظم "جاوید نامہ" جس کے دو ہزار اشعار ہوں گے ابھی ختم نہیں ہوئی ممکن ہے مارچ تک ختم ہو جائے۔ یہ ایک قسم کی ڈوائن کامیڈی ہے اور مثنوی مولانا رومؒ کی طرز پہ لکھی گئی ہے" [2]

یہ کتاب ۲۲ اپریل تک مکمل ہو چکی تھی گو کہ فروری ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب

---

[1] مکاتیب حصہ دوم مکتوب ۹۶
[2] مکاتیب حصہ اول نمبر ۱۰۸
[3] مکاتیب حصہ دوم نمبر ۱۸۰
[4] مکاتیب حصہ دوم نمبر ۱۸۶

ں وہ رومی کی زبانی ، اسرار معراج بیان کرتے ہیں:۔

شاہد ثالث شعور ذات حق — خویش را دیدن بنور ذات حق
پیش نورش ار بمانی استوار — حیّ و قائم چوں خدا خود را شمار
مرد مومن در نسازد با صفات — مصطفیٰ راضی نہ شد الا بہ ذات
چیست معراج؟ آرزوئے شاہدے — امتحانے روبروئے شاہدے
شاہدِ عادل کہ بے تصدیق او — زندگی ما را چوگل را رنگ و بو
در حضورش کس نماند استوار — ور بماند، ہست او کامل عیار
ذرہ از کف مدہ تابے کہ ہست — پختہ گیر اندر گرہ تابے کہ ہست
تابِ خود را بر فزودن خوشتر است — پیش خورشید آزمودن خوشتر است
پیکر فرسودہ را دیگر تراش — امتحان خویش کن موجود باش!
ایں چنیں موجود محمود است و بس — ورنہ نار زندگی دود است و بس

مرد مومن کے لئے ان اشعار میں بھی پیام ہے اور اس جوش اور گرمی (تاب) ں اہمیت پر زور دیا گیا ہے، جس سے زندگی محمود بن سکتی ہے۔

معراج مبارک انسانی صلاحیتوں کا منتہیٰ ہے۔ جس کے متعلق علامہ اقبال نے

ےؔ جلال الدین جمالی کا شعر ہے :۔

موسیٰ زہوش رفت بیک جلوۂ صفات — تو عین ذات می نگری در تبسمی

بالِ جبریل کا پہلا شعر بھی اسی انداز کا ہے۔

ری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں — غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

کئی مقامات پر عجیب عجیب نکات بتائے ہیں اور قوم کو بیدار کرنے کے لئے اس سے بہت مفید نتائج اخذ کئے ہیں۔

مثلاً بانگ درا میں فرماتے ہیں ؎

رہِ یک گام ہے ہمت کے لئے عرشِ بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

بالِ جبریل میں ہے :-

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اور ضرب کلیم میں ارشاد ہے :-

ناوک ہے مسلماں، ہدف اسکا ہے ثریا
ہے سِرّ سراپردۂ جاں نکتۂ معراج

جاوید نامہ میں بارہا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کا ذکر ہے ایک موقع پر خلافت آدم کے ذیل میں کس قدر خلوص سے کہا ہے :-

مصطفےٰ اندر حرا خلوت گزید ... مدتے جز خویشتن کس را ندید
نقش مارا در دل او ریختند ... ملتے از خلوتش انگیختند
می توانی منکرِ یزداں شدن ... منکر از شانِ نبی نتواں شدن [1]

---

[1] ایک جگہ یہ شعر بھی ہے۔

قوتِ قلب و جگر گردد نبی ... از خدا محبوب تر گردد نبی

یہ آخری شعر ہزاروں نعتوں پر بھاری ہے۔ اور سراپا حقیقت ہے، کتاب کے آخر میں
ماب بہ جاوید (نژادِ نو) ہے، اس میں ادب اور عشق کا خاص پیام ہے، لکھتے ہیں

دیں سراپا سوختن اندر طلب — انتہایش عشق و آغازش ادب
آبروئے گل ز رنگ و بوئے اوست — بے ادب بے رنگ و بوئے آبروست
نوجوانے را چو بینم بے ادب [1] — روز من تاریک می گردد چو شب
تاب و تب در سینہ افزاید مرا — یاد عہد مصطفےٰ آید مرا

اسی لئے "الطریق کُلّہٗ ادب" بھی کہا گیا ہے۔ اور سورۃ الحجرات (۲)
فرمان ہے :-

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ
صَوْتِ النَّبِیِّ

ترجمہ: اے ایمان والو۔ اپنی آوازوں کو نبیؐ کی آواز سے اونچا مت کرو [2]

جاوید نامہ میں منصور حلاج کی زبانی حقیقت محمدی کا راز بتایا ہے کہ نور محمدیؐ
سے کائنات میں بہار ہے۔ وہ جوہر دہر ہے اور دہر اسی سے پیدا ہوتا ہے، جس کی
سے تقدیر کی تشکیل ہوتی ہے۔

---

[1] ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک مرتبہ لوگوں نے دیکھا کہ علامہ اقبال سخت بے چین ہیں۔ پوچھنے پر بتایا
ج ایک نوجوان مسلمان مجھ سے ملنے آیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار محمد صاحب کہتا تھا
سخت افسوس ہوا۔ (حیاتِ اقبال) ص ۱۱۵)

[2] حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور امہات المومنین کے احترام کے لئے سورۃ الاحزاب کی
- (۶) بھی دیکھیں۔

پیش او گیتی جبیں فرسودہ است | خویش را خود عبدہٗ فرمودہ است
عبدہٗ از فہم تو بالا تر است | زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
جوہر او نے عرب نے عجم است | آدم است و ہم ز آدم اقدم است
عبدہٗ صورت گرِ تقدیر ہا | اندرو ویرانہ با تعمیر ہا
عبدہٗ ہم جاں فزا ہم جاں ستاں | عبدہٗ ہم شیشہ ہم سنگِ گراں
عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر | ما سراپا انتظار او منتظر
عبدہٗ دہر است و دہر از عبدہٗ | ما ہمہ رنگیم او بے رنگ و بو
عبدہٗ با ابتدا بے انتہا است | عبدہٗ را صبح و شام ما کجا است
کس ز سرِ عبدہٗ آگاہ نیست | عبدہٗ جز سرِّ الا اللہ نیست

دراصل عبدیت ہی مقامِ اقربیت ہے، جیسا کہ ارشاد ہے۔

۱۔ سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہٖ (بنی اسرائیل۔ ۱)

اور مقامِ محمود بھی اسی لیے ہے۔

۲۔ فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ (النجم۔ ۱۰)

۳۔ تبٰرک الذی نزل الفرقان علیٰ عبدہٖ لیکون للعٰلمین نذیرا (الفرقان)

جاوید نامہ کے بعد علامہ اقبال نے اپنی مثنوی "مسافر" ۱۹۳۴ء میں لکھی۔ ہو
یہ کہ نادر شاہ (والیٔ افغانستان) نے مولانا سلیمان ندویؒ سر راس مسعود اور علامہ
اقبال کو دینی اور تعلیمی امور میں مشورے کے لئے کابل دعوت دی۔ یہ تینوں حضرات
اکتوبر ۱۹۳۳ء کے آخر میں وہاں گئے اور قندھار کے راستے سے ۲؍ نومبر کو واپس

افسوس کہ واپسی کے چند روز بعد ہی نادر شاہ قتل کر دیے گئے۔[1]

مثنوی "مسافر" میں لکھتے ہیں:۔

فقر و شاہی وارداتِ مصطفےٰ است ‏ ‏ این تجلی ہائے ذاتِ مصطفےٰ است

این دو قوت از وجودِ مومن است ‏ ‏ این قیام و آن سجودِ مومن است

فقر سوز و درد و داغ و آرزوست ‏ ‏ فقر را در خوں تپیدن آبروست

مثنوی کے آخر میں ظاہر شاہ (ابنِ نادر شاہ) سے خطاب ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں:۔

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات ‏ ‏ در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات

می دہد ما را پیام لا تخف ‏ ‏ می رساند بر مقام لا تخف

قوتِ سلطان و میر از لا الٰہ ‏ ‏ ہیبتِ مردِ فقیر از لا الٰہ

تا دو تیغ لا و الّا داشتیم ‏ ‏ ما سوا اللہ را نشاں نگذاشتیم

'لا' اور 'الّا' کا سبق بھی حضور انور صلّی اللہ علیہ وسلم ہی کا عطیہ ہے، جس کا ذکر اس مثنوی میں اقوامِ سرحد سے خطاب کرتے ہوئے بھی کرتے ہیں:۔

اے زخود پوشیدہ خود را باز یاب ‏ ‏ در مسلمانی حرام است این حجاب

رمزِ دینِ مصطفےٰ دانی کہ چیست ‏ ‏ فاش دیدن خویش را شاہنشہی ست

چیست دین؟ دریافتن اسرارِ خویش ‏ ‏ زندگی مرگ است بے دیدارِ خویش

---

[1] بالِ جبریل میں بھی نادر شاہ پر چند اشعار ہیں ؎

سرشکِ دیدۂ نادر بہ داغِ لالہ فشاں

آں مسلمانے کہ بیند خویش را | از جہانے برگزیند خویش را
از ضمیرِ کائنات آگاہ اوست | تیغ لا موجود الا اللہ اوست

اسی مثنوی میں روحِ سنائی (المتوفی ۵۴۵ھ) بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرنے کا پیام دیتی ہے:-

مصطفےٰ بحر است و موج او بلند | خیز و ایں دریا بجوے خویش بند

پھر جنوری ۱۹۳۵ء میں بالِ جبریل شائع ہوئی۔ اس میں بھی متعدد مقامات پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

محمدؐ بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا | مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا
وہ دانائے سبل، ختم رسل مولائے کل جس نے | غبارِ راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر | وہی قرآں وہی فرقاں، وہی یٰسیں وہی طٰہٰ
سبق ملا ہے یہ معراج مصطفےٰ سے مجھے | کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں
عشق دمِ جبریل، عشق دلِ مصطفےٰ | عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا پیام

نظم ذوق و شوق میں مدینہ منورہ کی راہ کوہ اضم اور وادیٔ کاظمہ کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحاب شب
کوہِ اضم[1] کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں

---

[1] کوہ اضم اور کاظمہ کی تلمیح قصیدہ بردہ کے اس شعر سے ہے۔

گرد سے پاک ہے ہوا برگِ نخیل دھل گئے　　　　ریگِ نواحِ کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں

اسی نظم میں یہ شعر بھی ہے :-

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا　　　　عشق تمام مصطفیٰ، عقل تمام بولہب

علامہ اقبال کو غالباً اواخر جنوری ۱۹۳۴ء سے گلے کی تکلیف شروع ہوئی تھی۔ مکتوب نمبر ۱۵۶ (حصہ اول) میں لکھتے ہیں کہ "مجھے تقریباً دو ڈھائی ماہ سے (Acute Laryngitis) کی شکایت ہے۔ جس کی وجہ سے بولنے اور عام طور پر کلام کرنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ بہت علاج کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ لندن انشاءاللہ اگلے سال جاؤں گا"۔ یہ مکتوب ۱۶ر اپریل ۱۹۳۴ء کا ہے۔ پھر کئی دوسرے مکاتیب مثلاً (۱۱۶ - ۱۲۵ حصہ دوم) میں بھی اس کا ذکر ہے۔ ۲۳ر مئی ۱۹۳۵ء کو علامہ کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔ (مکتوب ۲۱۲ حصہ اول) لیکن پھر بھی ۳۰ر مئی ۱۹۳۵ء (مکتوب ۲۱۳ حصہ اول) کو قرآن سے متعلق ایک کتاب لکھنے کا عزم ظاہر کرتے ہیں۔ پھر ۳ر اپریل ۱۹۳۶ء کے خواب کا ایک مکتوب (نمبر ۲۳۵ حصہ اول) میں ذکر کرتے ہیں کہ :-

"۳ر اپریل ۱۹۳۶ء کی رات ۳ بجے کے قریب (میں اس شب بھوپال میں تھا) میں نے سر سید علیہ الرحمۃ کو خواب میں دیکھا۔ پوچھتے ہیں تم کب سے بیمار ہو۔ میں نے عرض کیا۔ دو سال سے اوپر مدت گزر گئی۔ فرمایا حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرو۔ میری آنکھ اسی وقت کھل گئی۔ اور اس عرضداشت کے چند شعر جو اب طویل ہوگئی ہے۔ میری زبان پر جاری ہوگئے۔ انشاءاللہ ایک مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کے نام کے ساتھ یہ عرضداشت شائع ہوگی۔ ۴ر اپریل کی صبح سے میری آواز

میں تبدیلی شروع ہوئی۔ اب پہلے کی نسبت آواز صاف تر ہے۔ اور اِس میں رنگ (RING) عود کر رہا ہے۔ جو انسانی آواز کا خاصہ ہے گو اس ترقی کی رفتار بہت سست ہے۔

چنانچہ یہ فارسی مثنوی گو ستمبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کی ترتیب اس خواب کے بعد ہی شروع ہو گئی ہو گی۔

یہ خواب اِس مثنوی میں اِس طرح درج ہے:۔

در حضورِ رسالت مآبؐ

اے تو ما بیچارگاں را ساز و برگ
وارہاں ایں قوم را از ترسِ مرگ

سوختی لات و مناتِ کہنہ را
تازہ کردی کائناتِ کہنہ را

در جہانِ ذکر و فکرِ انس و جاں
تو صلوٰتِ صبح تو بانگِ اذاں

لذتِ سوز و سرور از لا اِلٰہ
در شبِ اندیشہ نور از لا اِلٰہ

ذکرِ تو سرمایۂ ذوق و سرور
قوم را دارد بہ فقر اندر غیور

اے مقام و منزلِ ہر راہرو
جذبِ تو اندر دلِ ہر راہرو

سازِ ما بے صورت گردید آں چناں
زخمہ بر رگہائے او آید گراں

در عجم گردیدم و ہم در عرب
مصطفیٰ نایاب و ارزاں بولہب

ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ
ظلمت آبادِ ضمیرش بے چراغ

ایں ز خود بیگانہ، ایں مستِ فرنگ
نانِ جو می خواہد از دستِ فرنگ

نان خرید ایں فاقہ کش با جانِ پاک
داد مارا نالہائے سوزناک

مومن و از رمزِ مرگ آگاہ نیست | در دلش لا غالب الا اللہ نیست
تا دلِ او در میان سینہ مُرد | می نیندیشد مگر از خواب و خورد
قم باذنی گوئے واو را زندہ کن | در دلش اللہ ہُو را زندہ کن

پھر چند اشعار کے بعد علامہ اقبال اپنی بیماری کا ذکر کرتے ہیں اور اس کا علاج چاہتے ہیں۔

آں نواں دردے کہ در جان و تن است | گوشۂ چشمِ تو داروئے من است
در نسازد با دوا ہا جانِ زار | تلخ و بویش بر مشامم ناگوار
کار ایں بیمار نتواں بُرد پیش | من چو طفلاں نالم از داروئے خویش
تلخئ او را فریبم از شکر | خندہ ہا در لب بدوزد چارہ گر
چوں بصیری از تو می خواہم کشود | تا بمن باز آید آں روزے کہ بود
مہرِ تو بر عاصیاں افزوں تر است | در خطا بخشی چو مہرِ مادر است

اس مثنوی میں بھی جگہ جگہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قوم کو رجوع ہونے کا مشورہ دیا ہے۔

مردِ حق باز آفریند خویش را | جز بہ نورِ حق نہ بیند خویش را
بر عیارِ مصطفیٰ ؐ خود را زند | تا جہانے دیگرے پیدا کند

عصرِ ما ما را ز ما بیگانہ کرد | از جمالِ مصطفیٰ بیگانہ کرد

شرع برخیزد ز اعماقِ حیات | روشن از نورش ظلامِ کائنات

گر جہاں داند حرامش را حرام | تا قیامت پختہ ماند ایں نظام
نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر | با نگاہے دیگرے او را نگر
حکمش از عدل است و تسلیم و رضاست | بیخ او اندر ضمیر مصطفیٰؐ است

چوں بنامِ مصطفیٰؐ خوانم درود | از خجالت آب می گردد وجود
عشق می گوید کہ اے محکوم غیر | سینۂ تو از بتاں مانند دیر
تا نداری از محمدؐ رنگ و بو | از درود خود میالا نامِ او

۱۴ر جون ۱۹۳۶ء کے مکتوب نمبر ۱۴۱ (حصہ اول) میں علامہ لکھتے ہیں :۔ ضرب کلیم امید ہے کہ اس ماہ کے آخر تک چھپ جائے گی۔ فارسی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق"[1] اس کے بعد شائع ہوگی۔ خیال ہے کہ اس سال جولائی میں ضربِ کلیم اور یہ فارسی مثنوی ستمبر میں شائع ہوئی ہے[2]

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ضربِ کلیم میں سے بھی چند اشعار جو نظم "اے روحِ محمدؐ" میں ہیں پیش کئے جائیں :۔

شیرازہ ہوا ملّتِ مرحوم کا ابتر | اب تو ہی بتا تیرا مسلماں کدھر جائے
وہ لذّتِ آشوب نہیں بحرِ عرب میں | پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے
ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد | اس کوہ و بیاباں سے حدی خواں کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ | آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

---

[1] ۔ اس مثنوی کے متعلق خود علامہ کی رائے مکتوب نمبر ۱۸۷ (حصہ اول) میں دیکھیں

[2] ۔ "اشاریہ ہائے آثارِ منظوم اقبال" (پنجابی ادبی اکیڈیمی۔ لاہور ۱۹۷۵ء) صفحہ ۶ .

اس کتاب[۱] میں بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے قوی رشتہ رکھنے کے لئے تاکید ہے

دین مسلک زندگی کی تقویم   دیں سِرِّ محمدؐ و براہیم
دل در سخن محمدی بند   اے پور علیؓ بو علی چند
چوں دیدۂ راہ بیں نداری   قاید قرشی بہ از بخاری[۲]

اب ہم علامہ اقبال کی زندگی کے بالکل آخر دور سے متعلق عرض کرنا چاہتے ہیں۔ اس دور میں ہم انھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں بے تاب و بے قرار دیکھتے ہیں۔ ۹ ارفروری ۱۹۳۷ء کے مکتوب نمبر ۲۰۴ (حصہ اول) سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاحب نے ان سے ایک رباعی (قطعہ) مانگ لی تھی۔ جس کا ایک مصرع یہ ہے :-

از نگاہِ مصطفےٰ پنہاں بگیر

علامہ نے اپنی تڑپ اور بے تابی۔ نیز انتہائی عقیدت کا اظہار جو اس کتاب میں موجود ہے اس طرح کردیا۔

بہ پایاں چوں رسد ایں عالم پیر   شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر

۱۔ مکتوب نمبر ۲۲۵ (حصہ اول) میں علامہ لکھتے ہیں۔
اس کتاب کا REALISTIC ہونا ضروری ہے اور نوائے چنگ کی ملحق EPIGRAMMATIC STYLE سے کی گئی ہے :-

۲۔ مکتوب نمبر ۱۵ (حصہ اول) میں علامہ اس شعر کے متعلق لکھتے ہیں :- قرشی سے مراد حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ بخاری سے مراد بو علی سینا

حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر ‏ ‏ ‏ ‏ ممکن[1] رسوا حضور خواجہ ما را

غلام بھیک نیرنگ لکھتے ہیں۔

۱۹۳۷ء کے موسمِ سرما میں ایک روز جاوید منزل میں ان سے ملاقات ہوئی دیر تک صحبت رہی۔ وہ اس وقت بہت کمزور تھے۔ سفرِ مدینہ کا ذکر بھی رہا۔ کہنے لگے کہ جس قدر تھوڑی طاقت مجھ میں باقی رہ گئی ہے، میں اس کو مدینہ کے سفر کے لئے بچا بچا کر رکھ رہا ہوں۔ افسوس کہ ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی اور وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اقبالؔ کا قلبی تعلق حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات قدسی صفات سے اس قدر نازک تھا کہ حضورؐ کا ذکر آتے ہی ان کی حالت دگرگوں ہو جاتی تھی۔ اگرچہ وہ فوراً ضبط کر لیتے تھے۔ چونکہ میں بارہا ان کی یہ کیفیت دیکھ چکا تھا۔ اس لئے میں نے ان کے سامنے تو نہیں کہا۔ مگر خاص لوگوں سے بطورِ راز ضرور کہا کہ یہ اگر حضور کے مرقدِ پاک پر حاضر ہونگے تو زندہ واپس نہیں آئیں گے، وہیں جاں بحق ہو جائیں گے۔[2]

---

[1] اسی خجالت کا اظہار اسرار خودی میں بھی کیا تھا

موجِ آب از چشمۂ خاور مجو ‏ ‏ ‏ ‏ رزقِ خویش از رحمتِ دیگر مجو

روزِ فردائے کہ باشد جاں گسل ‏ ‏ ‏ ‏ تا نباشی پیشِ پیغمبر خجل

مثنوی "پس چہ باید کرد" میں بھی ہم یہ شعر پڑھ چکے ہیں

چوں بنامِ مصطفیٰ خوانم درود

از خجالت آب می گردد وجود

[2] رسالہ اقبال۔ لاہور اکتوبر ۱۹۵۷ء۔ صفحہ ۳۰

اسی زمانے میں مکتوب نمبر ۱۱۹ (حصہ اول) ۲ر دسمبر ۱۹۳۷ء کو پیر غلام میران شاہ کے
نام لکھا تھا۔

"کاش میں بھی آپ کے ساتھ (حج کے لئے) چل سکتا۔ اور آپ کی صحبت کی
برکت سے مستفیض ہوتا لیکن افسوس ہے کہ جدائی کے ایام ابھی باقی معلوم
ہوتے ہیں۔ میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ حضورؐ کے روضۂ مبارک پر
یاد بھی کیا جا سکوں۔ تاہم حضورؐ کے اس ارشاد سے جرأت ہوتی ہے۔
الطالح لی یعنی گنہ گار میرے لئے ہے۔ امید ہے کہ آپ اس دربار میں
پہنچ کر مجھے فراموش نہ فرمائیں گے۔"

حج اور زیارت مدینہ منورہ کی اسی تڑپ کا اظہار کئی مکاتیب میں ہے:۔
پیر صاحب موصوف جب حج سے واپس آئے تو اس وقت بھی علامہ اقبالؒ نے ان
کو خط لکھا: مکتوب نمبر ۱۲۱ (حصہ اول) مورخہ ۲۹ر مارچ ۱۹۳۸ء میں (یعنی انتقال سے قریب
تین ہفتے پہلے) لکھتے ہیں:۔

"..... دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ آپ کو اس امر کی توفیق دے کہ آپ
اپنی قوت، ہمت اثر و رسوخ اور دولت و عظمت کو حقائق اسلام کی
نشر و اشاعت میں صرف کریں۔ اس تاریک زمانے میں حضور رسالتمآب
صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ جلد آپ
کی طبیعت میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا ہو۔ جس کی ابھی تک آپ کو
توقع نہیں۔ افسوس ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں جن بزرگوں نے علمِ
اسلام بلند کیا ان کی اولادیں دنیوی جاہ و منصب کے پیچھے پڑ کر تباہ ہو گئیں

اور آج ان سے زیادہ جاہل کوئی مسلمان مشکل سے ملے گا۔ الا ماشاء اللہ۔ وقت تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ انہی بزرگوں کی اولاد سے کسی کی روحانیت کو بیدار کر دے اور کلمۂ اسلام کے اعلاء پر مامور کرے۔....."

علامہ اقبالؔ کی زندگی کے آخری ایام کا ذکر ہے کہ مولانا اسلم جیرا جپوری 'یوم اقبال' کے موقع پر ان سے نیاز حاصل کرنے کے لئے تشریف لے گئے۔ اس سال ان کا ارادہ حج کرنے کا تھا لیکن "بیماری اور کمزوری کی حالت یہ تھی کہ کوٹھی سے باہر نکلنا بھی مشکل تھا۔ کہتے تھے کہ میں دو سال سے ارادتاً سفرِ حج میں ہوں۔ عملاً جب موقع اللہ دے۔ بلکہ وہ اشعار بھی لکھ لئے ہیں جو اس سفر سے متعلق ہیں۔ ان میں سے کہیں کہیں سے کچھ سنایا بھی ۔۔۔ مکہ سے مدینہ کی روانگی کے وقت کی ایک غزل لکھی ہے۔ جس میں اللہ کو مخاطب کرکے کہتے ہیں۔

تو باش ایں جا و باخاصاں بیامیز ؎ کہ من دارم ہوائے منزل دوست

یہ شعر سناتے ہی گریہ ایسا گلوگیر ہوا کہ آواز بند ہوگئی، اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ مجھے یہ دیکھ کر مجبوراً موضوعِ سخن بدلنا پڑا۔[1]

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عقیدت سے متعلق دوسرے واقعات بھی ملتے ہیں۔ مولانا مودودی لکھتے ہیں۔

"پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورے کے لئے علامہ اور سر فضل حسین مرحوم اور ایک دو اور مشہور قانون داں اصحاب کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شاندار کوٹھی میں ان کے قیام کا انتظام کیا۔ رات کو جس وقت

---

[1] آثار اقبال۔ حیدر آباد دکن ۱۹۴۶ء۔ صفحہ ۹۰

اقبال اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لئے گئے، تو ہر طرف عیش و تنعم کے سامان دیکھ کر اور ازراہِ اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پاکر معاً ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ جس رسول پاکؐ کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں۔ اس نے بوریے پر سوکر زندگی گزار دی تھی۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔ اس بستر پر لیٹنا اُن کے لئے ناممکن ہوگیا۔ اُٹھے اور برابر کے غسل خانے میں جاکر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کردیا۔ جب ذرا دل کو قرار آیا تو اپنے ملازم کو بلا کر اپنا بستر کھلوایا اور ایک چارپائی اسی غسل خانے میں بچھائی۔ اور جب تک وہاں مقیم رہے غسل خانے میں ہی سوتے رہے۔ یہ وفات سے کئی برس پہلے کا واقعہ ہے۔" [1]

مولانا مودودی یہ بھی لکھتے ہیں۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت کا حال اکثر لوگوں کو معلوم ہے۔ لیکن یہ شاید کسی کو نہیں معلوم ہے کہ انھوں نے اپنے سارے تفلسف اور اپنی تمام عقلیت کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ایک متاعِ حقیر کی طرح نذر کرکے رکھدیا تھا۔ حدیث کی جن باتوں پر نئے تعلیم یافتہ نہیں پرانے مولوی تک کان کھڑے کرتے ہیں اور پہلو بدل کر تاویلیں کرنے لگتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر آف

---

[1] جوہرِ اقبال۔ صفحہ ۹۴۔۴۰

فلاسفی ان کے ٹھیٹھ لفظی مفہوم پر ایمان رکھتا تھا۔ اور ایسی کوئی حدیث سن کر ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے دل میں شک کا گزر نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان کے سامنے بڑے اچنبھے کے انداز میں اس حدیث کا ذکر کیا جس میں بیان ہوا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصحاب ثلاثہ رض کے ساتھ احد پر تشریف رکھتے تھے، اتنے میں اُحد لرزنے لگا۔ اور حضورؐ نے فرمایا کہ ٹھہر جا، تیرے اوپر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہیدوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اس پر پہاڑ ساکن ہو گیا اقبال نے حدیث سنتے ہی کہا کہ اس میں اچنبھے کی کونسی بات ہے۔ میں اس کو استعارہ و مجاز نہیں بلکہ ایک مادّی حقیقت سمجھتا ہوں۔ اور میرے نزدیک اس کے لئے کسی تاویل کی حاجت نہیں۔ اگر تم حقیقت سے آگاہ ہوتے تو تمہیں معلوم ہوتا کہ ایک نبیؐ کے نیچے مادے کے بڑے سے بڑے تودے بھی لرز اُٹھتے ہیں۔ مجازی طور پر نہیں۔ واقعی لرز اُٹھتے ہیں۔" [1]

ارمغان حجاز علامہ اقبال کے انتقال کے بعد نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعض مضامین کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ حضور رسالتؐ کے عنوان سے جو فصل شروع ہوتی ہے اس کا آغاز عزت بخاری کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

آدب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

---

[1] جوہر اقبال ص ۳۸

علامہ اقبالؔ جو دل لے کر پیدا ہوئے تھے اس کی تسکین کے لیے عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) لازم تھا۔ وہ اپنی پیری کا ذکر کرتے ہوئے ایک پرندکی مثال پیش کرتے ہیں جو شام کو کسی آشیانے کی تلاش میں اُڑتا پھرتا ہے۔

بایں پیری رہ یثرب گرفتم نوا خواں از سرور عاشقانہ
چوآں مُرغے کہ در صحرا سرِشام کشاید پر بفکرِ آشیانہ

پھر عالمِ خیال میں صحرائے عرب کی سیر کرتے ہیں جہاں (مدینہ طیبہ کے راستے میں) کتنے قافلے درود پڑھتے ہوئے گامزن ہیں۔

چہ خوش صحرا کہ در وے کاروانہا درودے خواند و محمل براند
بہ ریگِ گرم او آور سجودے جبیں را سوز۔ تا داغے بماند

پھر اس صحرا کی دردمندی کا ذکر کرتے ہیں۔

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خنداست شبش کوتاہ و روزاو بلند است۔!
قدم اے راہرو آہستہ تر نہ چو ما ہر ذرّۂ او دردمند است

اس صحرا میں مستی اور جذب کے عالم میں عراقیؔ اور جامیؔ کے اشعار گنگناتے ہوئے چلتے ہیں۔

گہے شعر عراقی را بخوانم گہے جامی زند آتش بجانم
ندانم گرچہ آہنگِ عرب را شریکِ نغمہ ہائے سار بانم

پھر اپنے ساتھی سے کہتے ہیں۔

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم من وتو کشتۂ شانِ جمالیم
دو حرفے بر مراد دل بگوئیم : بپائے خواجہ چشماں رابمالیم

اسی راہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے مسلمان بھائیوں کی حالتِ زار کا ذکر کرتے ہیں۔

شب ہندی غلاماں را سحر نیست
بایں خاک آفتابے راگذر نیست
بما کن گوشۂ چشمے کہ در شرق
مسلمانے ز ما بیچارہ تر نیست

اس مسکین ہندی غلام کے لئے سورۃ الدھر کی آیت ۸ کے مطابق حق غلامی مانگتے ہیں

حق آں دہ کہ "مسکین و اسیر" است
فقیر و غیرتِ او دیر میر است
بروئے او در میخانہ بستند
دریں کشور مسلماں کشتہ میر است

اور اس کے لئے یہ گذارش کرتے ہیں کہ:۔

دگر پاکیزہ کن آب و گلِ او
جہانے آفریں اندر دلِ او
ہوا تیز و بہ امانش دو صد چاک
بیندیش از چراغِ بسملِ او

پھر مسلمانوں کے زوال کے بہت سے اسباب بھی بیان کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے دلوں میں غیر اللہ نے جگہ کرلی ہے۔ وہ موت سے ڈرنے لگے ہیں۔ ملوکیت نے انھیں فریب دے رکھا ہے۔ مشکل پسندی سے گھبراتے ہیں۔ مکتب نے انھیں دل مردہ بنا دیا ہے۔ وہ دل ضرور رکھتے ہیں، لیکن ان کے دلوں میں "محبوب" نہیں ہے۔ یقین سے محروم ہو گئے ہیں اور میری بات بھی نہیں مانتے۔ پھر انتہائی عشق میں، یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ

تو فرمودی رہ بطحا گرفتیم
وگرنہ جز تو مارا منزلے نیست

بے شک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے کرم سے اللہ کو پہچاننے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔

بچشمِ من نگہ آوردہ تست
فروغ لا الٰہ آوردہ تست

دو چارم کن بہ صبح من دانی　　　　شبم را تاب مہ آوردہ تست

کیونکہ ع　　　　جہاں از عشق و عشق از سینہ تست

اور آپ ہی کے طفیل میں ـ

تپیدم - آنـ - یدم آرمیدم

لیکن افسوس کہ ـ

ندانم با کہ گفتم نکتہ، شوق　　　　کہ تنہا بودم و تنہا سرودم

حالانکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ـ

چہ میگویم مسلمانم، بلرزم　　　　کہ دانم مشکلات لاالہٰ را

بہر حال علامہ اقبال ایک ہی آرزو رکھتے ہیں کہ "مارا مصطفیٰ بس"

بکوئے تو گداز یک نوا بس　　　　مرا ایں ابتداایں انتہا بس

خراب جرأت آں رند پاکم　　　　خدا را گفت، مارا مصطفیٰ بس

اس عشق و مستی کے عالم میں اگر کوئی ہم نوا مل جائے تو اس سے یہی کہا جائیگا کہ ـ

بیا باہم در آویزیم و رقصیم　　　　ز گیتی دل برانگیزیم و رقصیم

یکے اندر حریم کوچہ دوست　　　　ز چشماں اشک خوں ریزیم و رقصیم

اللہ اللہ کیا کیف و سرور ہوگا، اللہ پاک اس پر لاکھوں رحمتیں نازل فرمائے

کہا جاتا ہے کہ انتقال سے ۱۰ - ۱۲ منٹ پہلے یہ رباعی زبان پر تھی ـ

سرود رفتہ باز آید کہ ناید　　　　نسیمے از حجاز آید کہ ناید

سر آمد روزگارے ایں فقیرے　　　　دگر دانائے راز آید کہ ناید

ایک اور نعت علامہ اقبال کی یادگار ہے :-

اے کہ بر دلہا رموزِ عشق آساں کردہ ای ✤ سینہ ہا را از تجلی یوسفستاں کردہ ای

اے کہ صد طور است پیدا از نشانِ پائے تو ✤ خاکِ یثرب را تجلی گاہِ عرفاں کردہ ای

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک ✤ بزم را روشن ز نورِ شمعِ عرفاں کردہ ای

اے کہ ہم نام خدا بابِ دیارِ علم تو ✤ اُمیے بودی و حکمت را نمایاں کردہ ای

فیض تو دشتِ عرب را مطلعِ انظار ساخت ✤ خاکِ ایں ویرانہ را گلشن بداماں کردہ ای

دل ز نالد در فراق ماسوائے نورِ تو
خشک چوبے را ز ہجر خویش گریاں کردہ ای

مذکورہ بالا اشعار کے مطالعے سے اندازہ ہوگا کہ جس طرح علامہ اقبال نے اسلام کو سمجھنے کے لئے ایک نئے اندازِ فکر کی تشکیل کی تھی اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ سے صحیح فائدہ حاصل کرنے کے لئے ایسے نکات کی نشاندہی کی ہے جو عموماً اہل علم سے پوشیدہ ہیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے اس شعر میں بھی یہی نکات موجود ہیں۔

یا خاتم الرسل المبارک صنوۃ ✤ صلی علیک منزل القرآن[۱]

ترجمہ: اے خاتم المرسلین۔ آپ برکت و سعادت کا وہ سرچشمہ ہیں، جس پر قرآن نازل فرمانے والے نے درود و سلام بھیجا ہے۔

---

[۱] رسالہ اسلامی تعلیم لاہور۔ مارچ تا جون ۱۹۷۴ء۔ صـ۶

اِقبالؔ کے دینی عقائد

مختصر جائزہ!

عقائد کا اثر اخلاق پر پڑتا ہے۔ اور اخلاق سے جذبات متاثر ہوتے ہیں پھر شعوری یا غیر شعوری طور پر جذبات سے کلام بھی اثر پذیر ہوتا ہے۔ جو لوگ ظاہر و باطن، میں فرق رکھتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے زبان و بیان کی خوبی یا تجربات و مشاہدات کی ترجمانی سے یقیناً اثر آفرینی کرسکتے ہیں لیکن ایسا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ عبارت کی رنگ آمیزی، رونا بسورنا، تمثیلی حرکات و سکنات وغیرہ بہت سی چیزیں ہیں جن سے ایک فنکار فائدہ اٹھانا چاہتا ہے لیکن جس فن میں اخلاص نہیں وہ جلد ختم ہوجاتا ہے اور ظاہری رکھ رکھاؤ کے باوجود "فسانۂ و فسوں" بن کر رہ جاتا ہے فن میں جب اخلاق اور حقانیت کا پیوند لگ جاتا ہے تو پھر اس کے ذریعہ کردار کی تعمیر ہوسکتی ہے اور جہانِ تازہ کی نمود بھی ہوتی ہے اور جہاں اس اخلاق کا فقدان ہوتا ہے وہاں ع

ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی

اس تمہید کے بعد ہم اقبال کے دینی عقائد کے سلسلہ میں چند اشارے

پیش کر رہے ہیں۔

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال (م ۱۳۵۰ھ سنہ ۱۹۳۸ء)، نے علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ کو اپنے تیسرے (مطبوعہ) خط میں لکھا تھا کہ "میرا تو عقیدہ ہے کہ غلو فی الزہد اور مسئلہ وجود، مسلمانوں میں زیادہ تر بدھ مذہب کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ خواجہ نقشبند رحؒ اور مجدد سرہند رحؒ کی میرے دل میں بہت بڑی عزت ہے مگر افسوس ہے کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ یہی حال سلسلۂ قادریہ کا ہے جس میں میں خود بیعت رکھتا ہوں۔ حالانکہ حضرت محی الدین (جیلانی رحؒ) کا مقصود اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا تھا۔" (لاہور ۱۳ نومبر سنہ ۱۹۱۷ء)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھتے ہیں۔

ہمتِ اُو کشتِ ملت را چو ابر ثانیِ اسلام و غار و بدر و قبر

اور لکھتے ھیں۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

رموزِ بے خودی کے آخر میں "عرضِ حال" کے چند اشعار یہ ہیں۔

گر دلم آئینۂ بے جوہر است در بحرفم غیر قرآں مضمر است
اے فروغت صبح اعصار و دہور چشم تو بینندۂ ما فی الصدور
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
تنگ کن رخت حیات اندر برم اہل ملت را نگہدار از شرم
سبز کشتِ نابسامانم مکن بہرہ گیر از ابر نیسانم مکن

خشک گرداں بادہ در انگور من ۔۔۔ زہر ریزا اندر مئے کافور من
روز محشر خوار و رسوا کن مرا ۔۔۔ بے نصیب از بوسۂ پاکن مرا

اللہ اللہ! خلوص کی انتہا ہے اس دور میں بڑے بڑے اولیائے کرام کے یہاں بھی یہ خلوص دیکھنے میں نہیں آتا ان اشعار کے بعد اس دعا کے لئے بھی درخواست ہے۔ ع

عشق من گردد ہم آغوشش عمل

پھر ارمغان حجاز میں یہ قطعات بھی نظر آتے ہیں۔

دریں پیری رہ یثرب گرفتم
نواخواں از سرور عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام
کشاید پر بفکر آشیانہ

درآں دریا کہ او را ساحلے نیست ۔۔۔ دلیلِ عاشقاں غیر از دلے نیست
تو فرمودی رہ بطحا گرفتیم ۔۔۔ وگرنہ جز تو مارا منزلے نیست

ان اشعار کو پڑھ کر کون سی آنکھ ہے جو پرنم نہ ہوگی ہما

ہما ملاحظہ ہو تحقیقی جائزے صفحہ ۸۶، ۱۰۴۔ ۱۰۵

اقبالؒ اور ترک

اُردو شعراء نے ترک اور ترکی سے کہاں تک تعلق رکھا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ہماری، ادبی ثقافتی تاریخ میں ہی مل سکتا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان تعلقات اور روابط کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے۔

سندھ کا علاقہ ایران کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے ایران کے فتح ہونے کے بعد خود بخود مسلمانوں کے زیر اثر آگیا تھا۔ اور مسلمان تاجروں اور مسافروں نے اس کے سواحل کو اپنے لئے رہ گزر بنا لیا تھا۔ خلافتِ راشدہ کے بعد بنو اُمیہ جب خلافت اسلامیہ کے منصب پر متمکن ہوئے تو مسلمانانِ سندھ نے بھی دوسرے مسلمان ملکوں کی طرح ان کو اپنا خلیفہ تسلیم کیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سندھ کے راجاؤں کو دعوتِ اسلام کے خطوط لکھے تھے جس کی وجہ سے بقول بلاذری بہت سے راجا مسلمان ہو گئے تھے اور عربوں جیسے

نام بھی رکھ لئے تھے۔ بنو عباس کے ابتدائی دور میں ضعف تھا لیکن خلیفہ منصور کے زمانے میں مسلمانوں میں نئی قوت پیدا ہوئی۔ اور اس کے ایک نائب نے منصورہ شہر آباد کیا۔ خلیفہ معتصم کے بعد سندھ کی حیثیت ایک ریاست کی ہوگئی۔ اور ملک کا بڑا حصہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ لیکن مقامی لوگوں نے مسلمانوں کی مسجدوں کو قائم رکھا اور مسلمانوں نے جمعے کے خطبے میں خلیفہ وقت کے نام کو قائم رکھا۔ بعد میں یہاں دو فرقے بن گئے تھے۔ ایک اہل سنّت کا فرقہ جو بدستور خلافت عباسیہ سے تعلق رکھتا تھا اور دوسرا باطنیہ فرقہ جس کا تعلق مصر کے فاطمی سلاطین سے تھا۔

اِدھر شمال شرقی صوبے میں سلطان محمود غزنوی کی آمد سے مسلمانوں کو قوت حاصل ہوئی۔ وہ اپنی ہر فتح پر خلیفہ القادر باللہ کو اطلاع بھیجتا تھا اور دربار خلافت سے اس کے لئے خلعت اور علم آیا کرتے تھے، خود "سلطان" کا لقب جو محمود سے پہلے کسی دوسرے بادشاہ نے اختیار نہیں تھا وہ خلیفہ ہی کی طرف سے اسے عطا ہوا تھا۔ پھر یہ تعلق برابر قائم رہا حتیٰ کہ معتصم باللہ کے زمانے میں جب عباسی خلافت کو تاتاریوں کے ہاتھوں زوال ہوا تو یہ تعلق بغداد سے ختم ہوا۔ اور کچھ عرصہ بعد جب مصر میں دوبارہ اس خلافت نے ایک نئی زندگی حاصل کی تو ہندوستان کے سلاطین کا تعلق مصر سے ہوگیا سلاطین دہلی کے علاوہ اطراف ہند کے دوسرے مسلمان بادشاہ بھی خلیفہ کی اطاعت کو اپنے لئے بڑی سعادت سمجھتے تھے اور اپنے سکوں میں ان کا نام کندہ کراتے تھے۔

اس کے بعد خلفائے عثمانی کا زمانہ آتا ہے۔ سلطان سلیم نے مصر و شام اور عرب کو اپنے قبضے میں کر لیا اور تیمور کی اولاد نے ہندوستان کی مغربی سرحد پر قسمت آزمائی شروع کر دی۔ پھر سلیمان اعظم نے قسطنطنیہ کے تخت پر قدم رکھا اسی زمانے میں یعنی ۹۳۲ھ میں بابر نے ہندوستان کی حکومت سنبھالی عثمانی اور تیموری دونوں ترک تھے۔ لیکن لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ تیمور نے عثمانی بادشاہ بایزید یلدرم سے جنگ کی۔ اس جنگ کے لئے یونانی ریاست طرابزون نے سازش کی تھی بہر حال تیمور جیتا اور بایزید گرفتار ہوا۔ لیکن سلطنت عثمانیہ جلد سنبھل گئی ۹۳۲ھ میں جب بابر نے ہندوستان کے تخت پر قدم رکھا تو حرمین شریفین کے خادم یعنی خلیفہ عثمانی کو تحفے بھیجے اور ترکستان کے علماء کو انعامات روانہ کئے یہ تعلقات ۹۸۷ھ تک قائم رہے جبکہ اکبر نے لاکھوں روپے نقد اور سامان دے کر ایک امیر کو مکہ معظمہ بھیجا تھا لیکن اسی سال رجب میں اکبر کو "خلیفۂ عصر" اور "امام زماں" بنایا گیا تو سلاطین عثمانی کا مذہبی لقب بھی اسے دیا گیا یعنی حضرت سلطان الاسلام کہف الانام امیر المومنین ظل اللہ فی العالمین، اور کلمہ طیبہ کی بجائے "لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ" قرار پایا اور اب عثمانیوں سے وہ عقیدت نہیں رہی۔ جہانگیر کے زمانے میں بھی عثمانی خلیفہ سے تعلقات اچھے نہ رہے لیکن شاہجہاں نے ۱۰۲۹ھ میں سلطان محمد رابع کے لئے گراں بہا تحائف بھیجے اور اس نے بھی ایک قاصد کے ہاتھ بہت سے تحفے روانہ کئے۔ یہی تعلقات سلطان مغلیہ کے آخر تک قائم رہے پھر سلطان ٹیپو کے زمانے میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے لارڈ ولزلی گورنر جنرل تھا

اس نے اپنے سفیر اسپنز کے ذریعہ جو قسطنطنیہ میں تھا سلطان سلیم
ت کے دربار سے ایک خط ٹیپو کے نام بھجوایا، اس میں یہ لکھا تھا
پ فرانسیسیوں سے قطع تعلق کرلیں کیونکہ یہ لوگ مصر و شام میں ظالمانہ
ے کر رہے ہیں اور مسلمانوں کے خلیفہ کی توہین کر رہے ہیں"۔ یہ خط
ی سازش کے تحت لکھوایا گیا تھا۔ سلطان ٹیپو نے اس کے جواب میں لکھا
ہ بے شک فرانسیسی لوگ وفاشعار نہیں لیکن آج کل انگریز ہم سے لڑنے
ے ہیں اور ہر طرح کا سامان جنگ تیار کر رکھا ہے۔ اس بنا پر ہم پر بلکہ
مسلمانوں پر ان سے جہاد کرنا فرض ہے آپ ہمارے لئے دعا فرمائیں۔ ہم نے
ل خط ایک شخص کے ذریعہ مدینہ منورہ کی راہ پر آپ کو بھیجا ہے۔ اس
ہمارے مفصل حالات معلوم ہو سکیں گے"۔[1]

سلطان ٹیپو نے آخر ۱۲۱۳ھ میں شہادت پائی اور ذھب عز الروم و الھند
کلھا (روم اور ھند کی تمام عزت خاک میں مل گئی)

انگریز نے پھر بھی چین نہ لیا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے موقع پر سلطان
ید کی طرف سے ایک (فرضی ؟) فرمان مسلمانان ہند کے نام پہنچایا کہ وہ
ی حکومت کی اطاعت کریں۔ بہر حال اس کے بعد ہمارے ملک پر جو افتاد
وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ترکوں اور ہندی مسلمانوں کے باہمی اختلاط اور
باط کی ایک آخری کوشش یہ تھی کہ حضرت شاہ غلام علی دہلوی (م ۱۲۴۰ھ)

---

[1] سید سلیمان ندوی "خلافت اور ہندوستان" میں یہ واقعات مفصل درج ہیں۔ ہم نے اسی سے استفادہ کیا ہے

مسلمانوں نے اپنی بے بسی کے باوجود ان کی امداد کرنے کی کوشش کی بلکہ ۱۹۱۱ء میں جب اٹلی نے طرابلس الغرب پر حملہ کیا تو ہمارے غیر منقسم ملک میں سخت بے قراری پیدا ہوگئی تھی ان حالات اور واقعات سے متعلق اردو شعراء نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ہم یہاں اقبال کے تاثرات پیش کر رہے ہیں۔

بیسوی صدی کا ربع اول ترکوں کے لئے بہت صبر آزما تھا۔ سلطان عبد الحمید (المتوفی ۱۹۱۸ء) ۱۹۰۸ میں خلافت سے علیحدہ ہوئے اور ترکوں کی آزاد تحریک ابھی قوت پکڑنے نہ پائی تھی کہ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس الغرب پر حملہ کر دیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اس واقعہ سے بہت صدمہ پہنچا، انھوں نے مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں کی تحریک اور ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ترکوں کی امداد کے لئے چندہ فراہم کیا اور موصوف مرحوم ایک طبی وفد کے ساتھ قسطنطنیہ گئے۔ انگریزوں کو یہ جذبہ بہت ناگوار گذرا اور انھوں نے مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھانا شروع کئے۔ خود مولانا ظفر علی خاں کو ان کی واپسی پر قید کر لیا اور ان کا پریس اور اخبار زمیندار ضبط کر لیا۔ یہ مظالم سر مائیکل اڈوائر کے ایما پر ہوئے جو پنجاب کا گورنر تھا۔ اقبالؔ (المتوفی ۱۹۳۸ء) نے ان مظالم کے چڑھتے ہوئے دریا کے اترنے کی اس طرح پیشین گوئی کی تھی [۱]

دیکھ لوگے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل — موجِ مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائیگی

پہلی جنگِ عظیم کے بعد جب ترکوں کی حالت سنبھلنے لگی اور ہندوستان

---

[۱] محمد علی حصہ اوّل صفحہ ۱۵۳

میں مسلمانوں پر مظالم کم ہوئے تو اسی شعر کی مناسبت سے اقبال نے پھر کہا۔

توں نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج
موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

طرابلس کے متعلق بھی اقبال نے اپنے کلام میں تذکرہ کیا ہے اور ایک نظم فاطمہ بنت عبداللہ پر بھی لکھی ہے۔ جو غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوئی تھی اس نظم میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں۔

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

ہندوستان سے لیکر افریقہ تک جو مظالم مسلمانوں پر ہو رہے تھے چنانچہ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے شکوہ لکھا اور پھر اسی سال کے آخر میں مسلمانوں کے مرض کا علاج جواب شکوہ میں بتایا اس نظم میں بلغاریہ کے ہنگامے کا ذکر کیا ہے کہ:

ہے جو ہنگامہ بپا یورش بلغاری کا
غافلوں کے لئے پیغام ہے بیداری کا

اس بیداری کے لئے اقبال نے اسی سال اپنی نظم "شمع و شاعر" میں اور پھر "اسرار خودی" میں خودی کا نظریہ پیش کیا ہے۔

پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک رہی ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۵ء تک برطانیہ اور فرانس نے مل کر کوشش کی کہ درۂ دانیال پر قبضہ ہو جائے پھر GALLi POLi کے راستے خشکی پر سے بھی حملہ کیا لیکن ترکوں نے ہر بار انھیں پسپا کر دیا۔ چنانچہ برطانیہ نے ایک اور چال چلی وہ یہ کہ ۱۹۱۵ء میں اس نے کرنل لارنس کو مصر اور ترکی بھیجا۔ وہاں سے وہ عرب گیا اور عربوں کو ترکوں کے خلاف ابھارا، حجاز کا گورنر حسین بھی انگریزوں سے مل گیا اور وہ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۴ء تک وہاں کا خودمختار حاکم رہا جس کے بعد نجدیوں تلے سے مار بھگایا

اقبال نے اس ہاشمی حسین کے متعلق کہا۔

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰ
خاک و خون میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش

پہلی جنگ عظیم کی وجہ سے ترکوں کے ہاتھ سے عراق، مصر فلسطین اور حجاز نکل گئے۔ ہندی مسلمانوں کو سخت قلق ہوا۔ مولانا محمد علی نے خلافت تحریک شروع کی اور وفد لے کر انگلستان گئے تاکہ وہاں کے سیاسی لیڈروں کو ہموار کیا جائے اور خلافت عثمانیہ کو ختم ہونے سے بچالیا جائے۔ اقبال کو یہ گدائی سخت ناپسند تھی اس لئے انھوں نے کہا۔

نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

۱۹۲۲ء میں "خضر راہ" میں انھوں نے کہا

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

اور ایک جگہ اس طرح امید کی کرن دیکھتے ہیں۔

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

پہلی جنگ عظیم کے بعد مصطفیٰ کمال پاشا نے سنبھلنے کی کوشش کی ۱۹۱۹ء میں انقرہ میں نئی حکومت قائم کی ۱۹۲۲ء میں یونان کو شکست دی اور ۱۹۲۳ء میں مشرقی تھریس پر قبضہ کر لیا۔ پھر خلیفہ کا اثر ختم کر کے ترکی میں جمہوری حکومت قائم کی۔ یہ سب کچھ ترکوں کی ہمت اور استقلال سے اللہ پاک نے دیا۔ اقبال نے ایسے موقع پر کہا کہ

ثبات زندگی ایمان محکم سے ہے دنیا میں
کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی

اقبال اور برگساں

فرانسیسی مفکر ہنری برگساں جس نے قریب ۸۱ سال کی عمر میں ۴ جنوری ۱۹۴۱ء کو وفات پائی، علامہ اقبال کا ہم عصر، ہم مشرب اور کسی حد تک ہم خیال بھی تھا۔ نفسِ انسانی کے حقائق کا مطالعہ دوسرے مفکرین کی طرح ان دونوں نے بھی کیا ہے اور اپنی فکر کے نتائج مختلف کتابوں میں پیش کئے ہیں علامہ اقبال نے اپنے تحقیقی مقالے METAPHYSICS OF PERSIA کے سلسلے میں مشرق اور مغرب کے مفکرین کا مطالعہ کیا تو انھوں نے یہی چاہا کہ مشرقی فکر کو مغربی انداز میں پیش کیا جائے اور مادیت والے فلسفے کو اسلامی روحانیت سے قریب لایا جائے۔ اسی لئے برگساں اور اقبال میں ہم آہنگی کے باوجود بھی بنیادی فرق ہے اور اس امتیاز کے لئے وہ رموزِ بیخودی کے آخر میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض پرداز بھی ہیں کہ

گر دلم آئینۂ بے جوہر است ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
تنگ کن رختِ حیات اندر برم اہلِ ملت را نگہدار از شرم

چنانچہ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اسلامی اور مغربی فکر کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تاکہ ان دونوں مفکرین کے ذہنی ارتقار کو سمجھنے میں سہولت ہو۔ مسلمانوں میں دوسری صدی ہجری کے ابو ہاشم کوفیؒ اور جابر بن حیّان کوفیؒ اپنی زاہدانہ اور قناعت پسند زندگی کی وجہ سے صوفی کہلائے گئے۔ پھر حضرت بایزید بسطامیؒ (م ۲۶۱ھ) اور حضرت جنید بغدادی (م ۲۹۷ھ) نے وحدت الوجود کا نغمہ چھیڑا۔ لیکن امام غزالی (م ۵۰۵ھ) نے (تصوف کو فلسفے سے الگ رکھ کر) وجدان[1] پر زور دیا۔ وہ تاریخ فلسفہ میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے فرمایا کہ عقل انسانی چونکہ وجود حقیقی تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی اس لئے فلسفہ اور زندگی کے بنیادی مسائل کا حل وجدان کے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن انھوں نے اس وجدان کے حدود بھی مقرر کیے کیونکہ انسانی

---

[1] امام غزالیؒ نے وجدانی علم یا علم مکاشفہ کو اعلیٰ ترین درجہ دیا ہے اور اس کو معتبر اور یقینی کہا ہے اور اس کے برخلاف عقلی اور تجرباتی علم کو شک و شبہہ سے خالی نہیں سمجھا۔ لیکن حضرت مجدد الف ثانیؒ (م ۱۰۳۴ھ) نے علم مکاشفہ کو ایک حقیقت سمجھتے ہوئے بھی یقینی نہیں سمجھا۔ رومی اور ابن طفیل وغیرہ بھی وجدان کے قائل ہیں۔ لیکن رومی کے یہاں عقلِ کُلّی یا عقل نورانی یا خود عشق ہی وجدان کا قائم مقام ہے اور جو حق الیقین اس سے حاصل ہوتا ہے وہ دانشِ برہانی سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ علامہ اقبال نے بھی کہا ہے۔

اک دانشِ نورانی، اک دانشِ بُرہانی
ہے دانشِ بُرہانی حیرت کی فراوانی

عقل یا وجدان جیسی ناقص اور محدود شے ایک کامل اور لامحدود حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتی۔ اِلّا یہ کہ خود وہ حقیقت، وحی کے ذریعے، انسانی عقل و فہم کے مطابق اپنے آپ کو منکشف کر دے۔ امام غزالیؒ کے بعد محی الدین ابن عربیؒ (م ۶۳۸ھ) نے وحدت الوجود کو جواب تک وجدانی اور ذوقی چیز سمجھی جاتی تھی اپنے استدلال کے زور سے تصوف کے بجائے فلسفہ بنا دیا پھر فارسی شعراء نے اس مسئلے کو خوب اچھالا۔ بالآخر حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندیؒ (م ۱۰۳۴ھ) نے خالق اور مخلوق کے فرق پر زور دیا اور وحدت الشہود کا نظریہ پیش کر کے اتباعِ شریعت کو اصل قرار دیا۔

مسلمانوں کے برعکس مغرب کے بیشتر مفکرین نے اپنے اپنے نظامِ فکر میں خالق اور مخلوق کے امتیاز کو (جو اسلام کی اساس ہے) شعوری یا غیر شعوری طور پر نظر انداز کر دیا تھا یعنی انھوں نے جو نظامِ فکر پیش کئے ان میں ذات باری ہی کو کائنات میں گم کر دیا تھا۔ (پھر "وجودی" صوفیہ نے کائنات کو ذاتِ باری میں گم کر دیا) اور وہ یہ بات فراموش کر گئے تھے کہ وہ تمام حقائق جن کا اطلاق، کائنات جیسی ناقص اور محدود شے پر ہو سکتا ہے۔ ہستیِ کامل و لامحدود پر کیونکر ہو سکتا ہے؟ کائنات کی حقیقت جسمانی ہو یا روحانی، جامد ہو یا متحرک، ارتقاپذیر ہو یا غیر ارتقا پذیر، وہ بہرحال کائنات ہے اور خدا، خدا ہے۔ کائنات کی صفات اور خصوصیات کو ذات باری پر جو اس کائنات کا خالق ہے کس طرح منطبق کیا جا سکتا ہے؟ حضرت سعدی (م ۶۹۰ھ) نے کیا خوب کہا ہے

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہر چہ گفتہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم

بہر حال، مغرب کے مفکرین کی "عظمت" کے خلاف روسو ROUSSEU (م ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء) نے عَلَم بغاوت بلند کیا چنانچہ وہ لوگ جو فلاسفر کی "عقلیت" اور سائنس دانوں کی "مادیت" سے تنگ آچکے تھے انھوں نے اس بغاوت کو پسند کیا اور چونکہ برگسان بھی ایسی عقلیت کے خلاف وجدان پر زور دیتا تھا اس لئے وہ بھی مقبول ہوا اور وہ مغربی فلاسفہ میں پہلا شخص ہے جس نے واضح الفاظ میں وجدان کی اہمیت کو تسلیم کیا اور اپنی کتاب CREATIVE EVOELUTION کے ذریعے جدید فلسفے کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کردیا۔

بات دراصل یہ ہے کہ اشیار کی حقیقت کے سمجھنے کے لئے اب تک صرف دو طریقے رائج تھے۔ ایک فکر ہے اور دوسرا تجربہ افلاطون[۱] نے اپنے استاد سقراط کی طرح اس حقیقت کے سمجھنے کے لئے فکر اور تعقل کو ذریعہ سمجھا لیکن یہ بھی کہا کہ بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جن کے لئے تجربہ اور مشاہدہ ضروری ہے حالانکہ خود تجربہ بھی ناقص ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حواسِ خمسہ کے

---

[۱] افلاطون نے اشیار کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے صرف GENERAL IDEA (کلّیات) CONCEPTS (تصورات) اور UNIVERSAL TRUTHS (عالمگیر صداقتوں) کو ذریعہ قرار دیا تھا لیکن چونکہ اشیار ہر وقت متغیر ہوتی رہتی ہیں اس لئے وہ کہتا ہے کہ ان کا علم حقیقی اور اصلی نہیں ہے چنانچہ دنیا میں جو کچھ نظر آتا ہے۔ وہ لائقِ اعتبار نہیں۔ گویا اس طرح افلاطون نے عالم موجودات کا انکار کیا اور عالم غیر محسوس کا اثبات کیا۔

ذریعہ جو تجربات یا انکشافات ہوتے ہیں وہ خود غیر یقینی اور نامکمل (ناقص)
ہیں اور ان حواس کے
آگے جو چیزیں ہیں وہ بھی بہر حال اپنا وجود رکھتی ہیں۔ دوسرے الفاظ
میں یوں کہئے کہ عقل و فکر ہو یا تجربہ اور مشاہدہ ہو، ان سب سے نفسِ انسانی
DAVID HUME
کا مکمل اور یقینی پتا نہیں چلتا۔ چنانچہ ہیوم
(م ۱۷۷۶ء) اسے ہوہوم کہنے پر مجبور ہوا اور برکلے BERKELAY (۱۷۵۳ء)
نے علم اور حقیقت کو ایک سمجھتے ہوئے اس مادی دنیا کو بے حقیقت سمجھا
کیونکہ علم کا دامن ہمیشہ تنگ رہتا ہے اور وہ حقیقت کا احاطہ نہیں کر سکتا
غرض کہ مختلف مغربی مفکرین نے اشیاء کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے فکر اور تجربہ
سے آگے دوسری راہوں کی تلاش بھی جاری رکھی۔ آخر برگساں نے وجدان کی
اہمیت کو تسلیم کیا جس کو ہمارے صوفیہ بھی تسلیم کرتے تھے (گو کہ عام کاروباری
مسائل کے لئے وہ بھی فکر و تعقل کا سہارا لیتے تھے)۔ برگساں کے نظریات کو
اجمالی طور پر اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

"کائنات کی جس شے کا سب سے زیادہ یقینی علم ہے وہ ہماری
اپنی ذات ہے۔ اب اگر میں اپنی ہستی کا تجزیہ کروں اور غور
کروں کہ میں کیا ہوں، تو صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک
حالت سے دوسری حالت کی طرف جا رہا ہوں اور میری
ہستی انھی تبدیلیوں پر مشتمل ہے۔ اس طرح میں اپنی ذات
پر خواہ کتنی ہی توجہ دوں اور اس کو اپنی گرفت میں لینا
چاہوں، میری توجہ اور گرفت کا تعلق ہمیشہ کسی نہ کسی حالت

سے رہے گا۔ اب اگر ان حالتوں کا جائزہ لیا جائے جو مجھ پر
یکے بعد دیگرے طاری ہوتی رہتی ہیں اور بظاہر ایک دوسرے
سے علیحدہ وجود رکھتی ہیں تو معلوم ہو گا کہ میری انفرادی
حالت بھی لمحہ بہ لمحہ بدل رہی ہے۔"

اس طرح برگسان مسلسل تغیرات کا قائل ہے اور اس کے نزدیک زمان اور وقت ہی حقیقی واقعیت ہے کیونکہ اس میں مسلسل حرکت اور استمرار ہے اور یہ استمرار بذاتِ خود، ماضی کی ایک مسلسل ترقی ہے جو مستقبل سے وابستہ ہو جاتی ہے اور موجودہ حالتیں جو پچھلی حالتوں سے مختلف ہوتی ہیں وہ سب کی سب ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں جو مستقبل سے جوڑ دی جاتی ہیں۔ تاہم (جیسا کہ صوفیہ کا خیال ہے) ہمارے کاروباری مسائل کے لئے فکر اور تعقل سے مدد ملتی ہے لیکن حقیقت اور واقعیت تک رسائی کے لئے وجدان ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ زندگی کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے اور عقل اسے دور ہی سے دیکھتی ہے۔

اب علامہ اقبال کی مابعد الطبیعیات پر نظر ڈالئے۔ انھوں نے اپنے تحقیقی مقالے METAPHYSICS OF PERSIA کے سلسلے میں مشرق اور مغرب کے متفکرین کا مطالعہ کیا تھا۔ ہیگل HEGAL (م ۱۸۳۱ء) کے "طلسم خیالی" سے لے کر نطشے NIETZSCHE (م ۱۹۰۰ء) جیسے

ع قلبِ او مومن، دماغش کافر است

کا جائزہ بھی لیا تھا۔ افلاطون کے "گوسفندانہ" نظریوں (از گروہِ گوسفندانِ قدیم) اور شوپن ہار SCHOPEN HAUER (م ۱۸۶۰ء) والی "کرب والم کی دنیا"

کا فلسفہ بھی پڑھا تھا اور ساتھ ہی گوئٹے GOETHE (م ۱۸۳۲ء) کے فاؤسٹ FOUST میں خواہشات سے انسان کی ازلی کشمکش پر بھی غور کیا تھا لیکن اقبال صرف اسلام پیش کرنا چاہتے تھے (ع در بحر فکرم غیر قرآں مضمر است ...) اور اس کی تبلیغ کے لئے وہ فلسفہ اور مغربی طرزِ فکر کے ذرائع بھی استعمال کرنا چاہتے تھے، چنانچہ اسلامی مابعد الطبعیات کو انھوں نے متصوفین اور متکلمین کے رنگ میں مطالعہ کر کے اپنی شاعری میں دلکش انداز میں پیش کیا۔ برگساں والے حقیقتِ وقت کے فلسفے کو اسرارِ خودی میں ملاحظ فرمائیں

این و آں پیداست از رفتارِ وقت زندگی سر است از اسرارِ وقت
اصل وقت از گردشِ خورشید نیست وقت جاوید ست و خور جاوید نیست

برگساں ایسے وقت اور زمانہ کا قائل ہے جس میں استمرار ہی استمرار ہے۔ وہ دہر کو اصل حقیقت سمجھتا ہے کہ دہر زمانہ ہے جو مکان سے بالکل الگ چیز ہے یعنی زمانہ لامکانی ہے لیکن وہ ایک تخلیقی قوّت ہے۔ اس لیئے اس میں تغیّر اور تقاضر وری ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ELAN VITAL (یا VITAL SPARK) یعنی وجدان لافانی شے ہے جس طرح زمان لافانی ہے (گو کہ مکان سے متعلق تمام چیزیں فنا ہو سکتی ہیں) اور زمان کو وجدان کے اندر جگہ دی گئی ہے یعنی زمان انسان کے اندر ہے (اور انسان زمان کے اندر نہیں) اور وجدان ایسی شے ہے جس کی بدولت انسان، وقت (زمان) کا آقا، اس کا خالق اور اس کی اصل روح ہے۔ اقبال نے بھی برگساں کی طرح دہر اور وقت کی بقا اور استمرار کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ایک مسلمان کی حیثیت

سے وقت کے متعلق وہ کہتے ہیں۔

وقت ما کو اوّل و آخر نہ دید
از خیابانِ ضمیر ما دمید

اور اسی کے ساتھ وہ اس حدیث کا ذکر بھی کرتے ہیں جس میں ارشاد ہے کہ "زمانے کو بُرا نہ کہو۔ اس لئے کہ اللہ ہی زمانہ ہے"۔

زندگی دہر است و دہر از زندگی ست
لاتسبّوا الدھر فرمانِ نبیؐ ست

یہ شعر مثنوی اسرارِ خودی کا ہے جو پہلی بار ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی تھی اور جنوری ۱۹۳۳ء میں جب علامہ اقبال نے برگسان سے ملاقات کی تو اس شعر والی حدیث کا ذکر آیا۔ پوری حدیث یہ ہے۔ لاتسبّوا الدھر فانّ الدھر ھو اللہ ۔ (زمانے کو برا نہ کہو اس لئے کہ اللہ ہی زمانہ ہے) ڈاکٹر سعید اللہ نے جب علامہ اقبال سے ملاقات کی تو دریافت کیا کہ "اس کا کیا مطلب ہے؟ پہلے تو ہوں۔ ہاں کرتے رہے۔ آخر کہا کہ REALITY کا لازمی جزو دھر ہے۔ اتنا کہا اور خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا۔ پیرس میں برگسان سے جب ملاقات ہوئی تو اُسے GOUT کی شکایت تھی۔ پہیوں والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ نوکر کرسی کو چلا کر اِدھر سے اُدھر لے جاتا تھا۔ میں نے برگسان کو یہ حدیث سنائی تو وہ کرسی سے اچھل پڑا۔ پوچھا یہ کون کہتا ہے؟ میں نے کہا، ہمارا رسولؐ ......" ؎۱

؎۱ ملفوظاتِ اقبال مرتبہ محمود نظامی (لاہور ۱۹۴۹ء) صفحہ ۱۴۰

برگسان کی طرح اقبالؔ بھی عقل (دانشِ برہانی) کے بجائے شوق، عشق اور دانشِ نورانی کا اعتبار کرتے ہیں۔ انھوں نے کئی جگہ کہا ہے۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں اُس کی تقدیر میں حضور نہیں
گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے
مقام عقل سے آساں گزر گیا اقبالؔ مقامِ شوق میں کھو گیا وہ فرزانہ

اور برگسان کی طرح اقبالؔ نے بھی زمان والی حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے ہر چیز کے ارتقاء کے لئے بے قراری اور تازگی (جدّت) کو ضروری سمجھا ہے وہ کہتے ہیں۔

ٹھہرتے نہیں کاروانِ وجود کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں
ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار ذوقِ جدت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار

لیکن اقبال نے کائنات کے استمرار کو برگسان کی طرح محض استمرار نہیں سمجھا بلکہ اسے نقصان سے کمال اور کمال سے اکملیت کی طرف گامزن سمجھا ہے فرماتے ہیں۔

فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو
زندگی کا شعلہ اس ذرے میں جو مستور ہے
خودنمائی، خودفزائی کے لئے مجبور ہے

اسی طرح "روز و شب" کا سلسلہ بھی کائنات کے استمرار اور حادثات

کے پیامِ حیات کی نشاندہی کرتا ہے۔

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات — سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ — جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب سازِ ازل کی فغاں — جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ کائنات

اور اگر ہمارے "روز و شب" میں استمرار اور حادثات نہ ہوں تو پھر ان کا سلسلہ "اصلِ حیات" نہیں ہوگا بلکہ "اصلِ ممات" (جامد اور بے حرکت)

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

برگسان اور اقبال میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ برگسان نے کائنات کو ایک بدلتی ہوئی حقیقت کہا ہے جس کے سامنے "تغیر" ہی اصل مقصد ہے۔ چنانچہ نفسِ انسانی بھی اپنی تخلیقی صلاحیت کی وجہ سے خود بخود استمرار کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہر زندگی اس کے نزدیک محض "تغیر" اور تخلیق سے عبارت ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ خود بخود کا استمرار کافی نہیں بلکہ نفسِ انسانی کے لئے "جرأتِ رندانہ" اور "جوشِ کردار" کی بھی ضرورت ہے۔

پیری میں، فقیری میں، شاہی میں، غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ

کیونکہ

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

پھر فرد اور جماعت کے "انا" یا "شعورِ ذات" میں بھی برگسان اور اقبال کے یہاں تھوڑا سا فرق ہے۔ کانٹ اور نٹشے کی طرح برگسان کا خیال ہے کہ اگر فرد میں "شعورِ ذات" پیدا ہو جاتا ہے تو وہ وسعت اختیار کر کے جماعت یا سوسائٹی میں بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن اقبال کے یہاں یہ "شعورِ ذات" محض مادی نہیں بلکہ روحانی ہے اور گو کہ ذات کی کاروباری حیثیت کے لئے وہ ظاہری سہی، لیکن ذات کی اندرونی حقیقت کا تعلق چونکہ وجدان سے ہے۔ اس لئے وہ روحانی ہے۔ اقبال نے علم وعقل کے مقابلے میں اس شعور کو عشق اور دل سے تعبیر کیا ہے۔ جس کے لئے "بجلیاں" اور "طوفان" ہی حلال ہیں "حاصل" اور "ساحل" اس کیلئے حرام ہیں۔

شورشِ طوفاں حلال، لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام

وجدان اور عشق کو اقبال نے اسلامی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ جو کائنات کی عین زندگی ہے۔

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات

مردِ خدا کا عمل، عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام

علم وعقل کے متعلق انھوں نے اس طرح بھی وضاحت کی ہے جس

طرح کہا تھا کہ : ع کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ

عقل ہم عشق است و از ذوقِ نظر بیگانہ نیست
لیکن ایں بے چارہ را آں جرأتِ رندانہ نیست

عقل "بے جرأتِ رندانہ" ہوتی ہے لیکن اگر وہ یہ "جرأت" حاصل کر لے تو پھر یقیناً اُسے "جہاں تابی" حاصل ہو سکتی ہے۔

عقلے کہ جہاں سوز دیک جلوہ بے باکش   از عشق بیاموزد آیین جہاں تابی

اور فلاسفہ کا وہ "عشق" جو "بے جرأتِ رندانہ" ہوا کرتا ہے محض "روباہی" ہے: ۔ ع   بے جرأتِ رندانہ ہر عشق ہے روباہی

اور "جرأتِ رندانہ" والے عشق کی بدولت فلسفیوں کی "حقیقی واقعیت" اسم بامسمّیٰ بن سکتی ہے۔ ورنہ وہ لوگ محض "بت کدۂ تصوّرات" کے آزر کہلائیں گے

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق   عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات

اور ایک جگہ تو وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ : ۔ ع عشق تمام مصطفیٰؐ، عقل تمام بولہب

بہر حال یہ عقل اپنی لاکھوں حکمتوں کے باوجود ایک "کلیم سربکف" کے سامنے ہیچ ہے اور عشق کی جرأتِ "بے خطر" کو دیکھ کر "محوِ تماشائے لبِ بام" ہی رہتی ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ کائنات کے استمرار اور ذاتِ انسانی کی رفعت کے لئے عشق سے بہتر اور وسیلہ نظر نہیں آتا۔ ع

عاشق آنست کہ بر کف دو جہانے دارد

اقبال اور تصوف

سورہ آل عمران (آیت ۱۶۴) میں آتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ج وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ہ

اللہ پاک نے احسان کیا ایمان والوں پر جو بھیجا رسول انہی میں کا، جو پڑھتا ہے ان پر آیتیں اس کی اور تزکیہ کرتا ہے ان کا اور سکھاتا ہے ان کو کتاب اور حکمت، اور وہ لوگ پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

اس آیت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی گئی ہے کہ وہ تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب بھی فرماتے ہیں تاکہ لوگوں میں کوئی باطنی بیماری نہ رہنے پائے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین بھی آپ کے نائبین کی حیثیت سے اصلاحِ نفس کرتے رہے اور ان کے بعد علما اور صلحا نے یہ خدمت انجام دی اسلام میں سب سے پہلے شخص جو صوفی کہلائے گئے وہ ابو ہاشم کوفی تھے جو سفیان ثوری کے معاصر تھے۔ بعض کے نزدیک پہلے صوفی جابر بن حیان تھے جو ابو ہاشم کوفی کی طرح دوسری صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان بزرگوں کی صوفیانہ اور زاہدانہ زندگی "ویزکیھم" کی عملی تفسیر تھی۔ پھر جن بزرگوں نے تصوف پر شروع شروع میں لکھا ہے ان میں جنید بغدادی (المتوفی ۲۹۷ھ)، ابونصر سراج طوسی (المتوفی ۳۷۸ھ)، ابوبکر بخاری کلاباذی (اواخر چہارم

صدی)، ابوالقاسم قشیری (المتوفی ۴۶۵ھ)، داتا گنج بخش لاہوری (المتوفی ۴۶۵ھ) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حضرت بایزید بسطامی (المتوفی ۲۶۱ھ) اور جنید بغدادی نے اپنے ذوق و وجدان کی بنا پر مسئلہ وحدۃ الوجود کا سب سے پہلے ذکر کیا تھا، لیکن ان کے بعد محی الدین ابن عربی (المتوفی ۶۳۸ھ) نے اس مسئلے کو ذہنی اور استدلالی جامہ پہنا کر ایک فلسفہ بنا دیا۔ مگر امام غزالی (المتوفی ۵۰۵ھ) نے پہلے ہی اسلامی عقائد کو صحیح اور اصلی صورت میں پیش کر کے تصوف کو فلسفے کی غلامی سے بچانے کی راہ ہموار کر لی تھی۔ تاہم فارسی اور اردو کے بیشتر شعرا نے وحدۃ الوجود ہی کے راگ الاپے اور "ہمہ اوست" کے مضامین سے اپنے کلام کو زینت بخشی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ "مسائلِ تصوف" صرف بیان ہی بیان میں تھے اور اکثر شعرا عملاً تصوف اور متصوفانہ زندگی سے خالی تھے۔

محی الدین ابن عربی نے جو مسئلہ وحدۃ الوجود پر بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وجود صرف ایک ہے اور تمام اشیا اسی ایک وجود کی تجلیات اور مظاہر ہیں۔ وجود حقیقی اور کائنات میں ذات وصفات کی نسبت ہے اور چونکہ صفات عینِ ذات ہیں اس لئے کائنات بھی حق تعالیٰ سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتی۔ بلکہ سب کچھ وہی وہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ سُبْحَانَ مَنْ خَلَقَ الْاَشْیَاءَ وَھُوَ عَیْنُھَا (پاک ہے وہ ذات جس نے اشیا کو پیدا کیا اور وہ خود عین اشیا ہے) اور یہ بھی کہا کہ اَلرَّبُّ حَقٌّ وَالْعَبْدُ حَقٌّ فَمَا اَدْرِیْ مَنِ الْمُکَلَّفُ (خدا بھی حق ہے اور بندہ بھی حق ہے۔ پھر مجھے معلوم نہیں کہ مکلف کون ہے) ع[1]

پھر حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ (المتوفی ۱۰۳۴ھ) نے اس "ہمہ اوست" کے نظریے کو "ہمہ از وست" بنا دیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

"اشیا نزد صوفیہ ظہوراتِ حق اند نہ عینِ حق۔ پس اشیا از حق باشند نہ حق۔ پس معنیٰ

این کلام ایشان کہ ہمہ اوست، ہمہ از وست باشد کہ مختار علمائے کرام است و نزاع درمیان علمائے کرام وصوفیۂ عظام فی الحقیقت ثابت نہ باشد۔ مآلِ قولین یکے بود۔ این قدر فرق است کہ صوفیہ اشیا را ظہورات حق می گویند و علما ازین لفظ نیز تحاشی می نمایند از جہتِ تحرز نمودن از توہم حلول واتحاد۔ ۲۲

صوفیہ کے نزدیک اشیا حق تعالیٰ کے ظہورات ہیں، نہ کہ حق تعالیٰ کا عین

پس اشیا حق تعالیٰ سے ہیں، نہ کہ وہ خود حق تعالیٰ ہیں۔ چنانچہ ان کے کلام ہمہ اوست کے معنی ہمہ از وست ہوں گے جو کہ علمائے کرام کے نزدیک مختار ہیں اور علما وصوفیہ کے درمیان حقیقت میں کوئی نزاع نہیں ہے۔ دونوں کے اقوال کا مقصد ایک ہے۔ صرف اس قدر فرق ہے کہ صوفیہ اشیا کو حق تعالیٰ کے ظہورات کہتے ہیں اور علما اس لفظ سے بھی اجتناب کرتے ہیں تاکہ حلول اور اتحاد کا وہم بھی پیدا نہ ہو سکے۔

تصوف اور متصوفین کے اس اجمالی جائزے کے بعد علامہ اقبال کے نظریۂ تصوف کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ یکسر تصوّف کے مخالف نہیں تھے بلکہ وہ ایسے تصوّف کے خلاف تھے جو بے عملی اور راہبانہ زندگی کی دعوت دے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی مسلّم ہے لیکن انگریزوں کو اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ یہ قوم متحد ہونے کی صلاحیت ضرور رکھتی ہے۔ چنانچہ ان کی قوت کو ختم کرنے کے لئے مختلف حربے استعمال کئے گئے۔ پادری فنڈر کو بلایا گیا۔ بریلوی اور دیوبندی جھگڑے کھڑے کئے گئے۔ ایک پیغمبر کو بھی پیدا کیا گیا۔ شدھی سنگھٹن تحریک شروع کرائی گئی اور زیادہ سے زیادہ پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ سید احمد خاں کے رسالہ "تہذیب الاخلاق" کے مضامین کے عنوانات ہی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ قوم میں کیا کیا

برائیاں پیدا ہو چکی تھیں یا پیدا کرائی گئی تھیں۔ تاہم راعی اور رعایا کے درمیان مصالحت و مفاہمت اور در مع الدھر کیف دار سید احمد خاں اور ان کے رفقا کا مشن تھا۔ لیکن علامہ اقبال کے کام کی نوعیت مختلف تھی۔ وہ "با زمانہ بساز" کے نہیں بلکہ "با زمانہ ستیز" کے قائل تھے اور ابھی یورپ ہی میں تھے کہ انہوں نے اسلامی حقائق کی اشاعت کو اپنا نصب العین بنالیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں: "جو خیالات میں نے ان مثنویوں ("اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی") میں ظاہر کئے ہیں ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں .... مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے۔"[۱۳] اقبال کا یہ مقصود اس لئے تھا کہ انگریز نے اسلامی حقائق سے روگردانی کرانے کے لئے اپنی تہذیب کو زیادہ جاذبِ نظر بنا دیا تھا۔ اقبال کہتے ہیں:

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

اس تہذیب کی وجہ سے مسلمانوں میں جو احساسِ کمتری پیدا ہوا ہے اس کے متعلق کہتے ہیں:-

افرنگ ز خود بے خبرت کرد و گرنہ اے بندۂ مومن تو نذیری، تو بشیری

اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے دوسرا زہرِ قاتل مغرب کا جذبۂ وطنیت ہے۔ یہی جذبۂ وطنیت اب نئے سرے سے پاکستان میں پیدا کرایا جا رہا ہے۔ اقبال نے کہا تھا:

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی ﷺ

مغرب نے تیسرا زہر تعلیم کے نظام کا پیش کیا تھا۔ اقبال نے صاف طور پر کہا ہے:

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروّت کے خلاف

مکتب و مدرسہ جز درس نبودن نہ دہند
بودن آموز کہ ہم باشی و ہم خواہی بود

اور یہ کہ:

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری، دے کے تجھے فکرِ معاش
مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

چوتھی مہلک چیز جو ان تمام مہلکات میں جاری و ساری ہے وہ "تخمین و ظن" ہے جو یقین کی ضد ہے اور اسی سے پستی، بے بضاعتی، احساسِ کمتری اور بے عملی پیدا ہوتی ہے، کیوں کہ بڑی سے بڑی قوت یقین کے فقدان سے ختم ہو جاتی ہے اور معمولی سی چیز بھی اس پر غالب آجاتی ہے۔ چنانچہ ہر وہ علم، عقل، فکر یا فلسفہ جو صرف سوچنا سکھائے اور عمل کے لئے آمادہ نہ کر سکے وہ "تخمین و ظن" ہے اور اقبال کے نزدیک مردود ہے اور وہ تصوّف بھی (اقبال کے نزدیک) صحیح نہیں جو بے عملی سکھائے۔

ع   بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست

ایسے نام نہاد تصوّف اور صوفیوں کے متعلق "اسرارِ خودی" میں کہتے ہیں:

دل ز نقشِ لا الہٰ بے گانۂ — از صنمہائے ہوس بت خانۂ

می شود ہر مو، درازئے خرقہ پوش — آہ زین سوداگرانِ دین فروش

حضرت مجدد الف ثانیؒ کی طرح اقبال بھی کہتے ہیں کہ ایسے صوفیوں کو قرآن سے وجد و حال پیدا نہیں ہوتا بلکہ اشعار کے سننے سے پیدا ہوتا ہے:

صوفیِ پشمینہ پوش حال مست — از شرابِ نغمۂ قوال مست

آتش از شعرِ عراقی در دلش — در نمی سازد بہ قرآن محفلش

ایسے صوفیہ وحدۃ الوجود کے فلسفے میں غرق ہو کر اپنے صحیح منصب کو بھلا چکے ہیں۔ "ساقی نامہ" میں کہتے ہیں:

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ خلق میں فرد — محبت میں یکتا، حمیت میں فرد

عجم کے خیالات میں کھو گیا — یہ سالک مقامات میں کھو گیا

۱۹۱۷ء میں وہ لکھتے ہیں:

"شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعرا ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفے کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلانِ طبیعت موجود تھا اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصے تک اس کا نشو و نما نہ ہونے دیا، تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا، یا بالفاظِ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدۃ الوجود تھی۔ ان شعرا نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے"[۵]

اسی طرح وجودی صوفیہ کے متعلق بھی وہ اسی سال لکھتے ہیں :

"میرا تو عقیدہ ہے کہ غلو فی الزہد اور مسئلہ وجود مسلمانوں میں زیادہ تر بدھ مذہب کے اثرات کا نتیجہ ہیں ۔ خواجہ نقشبند (المتوفی ۷۹۱ھ) اور مجدد سرہند (المتوفی ۱۰۳۴ھ) کی میرے دل میں بہت عزت ہے ۔ مگر افسوس کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے ۔ یہی حال سلسلہ قادریہ کا ہے جس میں مَیں خود بیعت ہوں ، حالانکہ حضرت محی الدین جیلانی ۔ المتوفی ۵۶۱ھ) کا مقصود اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا تھا ؏"

غلو فی الزہد اور وحدۃ الوجود کے علاوہ اقبال نے مسئلہ بروز کو بھی عجمی ایجاد کہا ہے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں : "جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ مسئلہ (بروز) عجمی مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اصل اس کی آرین ہے ؏" یعنی یہ تمام تعلیمات بے عملی سکھاتی ہیں ۔ لیکن حضرت مجدد الف ثانی اور ان کے متبعین سے اقبال کو صرف اس لئے محبت ہے کہ وہ جوش اور ولولہ سکھاتے ہیں اور عمل و عزم کی دعوت دیتے ہیں ۔ حضرت مجدد کے متعلق "بالِ جبریل" میں انہوں نے کہا ہے کہ :

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو
آنکھیں میری بینا ہیں ولیکن نہیں بیدار!
آئی یہ صدا سلسلۂ فقر ہوا بند
ہیں اہلِ نظر کشورِ پنجاب سے بیزار!
عارف کا ٹھکانہ نہیں وہ خطہ کہ جس میں
پیدا کلۂ فقر سے ہو طرۂ دستار!
باقی کلۂ فقر سے تھا ولولۂ حق
طروں نے چڑھایا نشۂ 'خدمتِ سرکار!'

حضرت مجدد کے متبعین میں بیدل بھی تھے۔ ان کے متعلق اقبال لکھتے ہیں:

"بیدل کے کلام میں خصوصیت کے ساتھ حرکت پر زور ہے۔ یہاں تک کہ اس کا معشوق بھی صاحبِ خرام ہے۔ اس کے برعکس غالب کو زیادہ تر اطمینان و سکون سے الفت ہے...... نقشبندی سلسلے سے اور حضرت مجدد الف ثانی سے بیدل کی عقیدت کی بنیاد یہی ہے۔ نقشبندی مسلک، حرکت اور روحانیت پر مبنی ہے۔"[۵۳]

اسی حرکت اور عشق سے متعلق "بانگِ درا" میں اقبال نے "مذہب" کے عنوان کے تحت بیدل کا یہ شعر تضمین کیا ہے:

باہر کمال اندکے آشفتگی خوش ست　　　ہر چند عقلِ کل شدۂ بے جنوں مباش

بہرحال اقبال کو صرف ایسے لوگ پسند ہیں جن میں عمل کا جذبہ ہے اور جو راہبانہ زندگی سے بیزار ہیں۔ انہوں نے افلاطون کو بھی اسی لئے پسند نہیں کیا کہ وہ وحدت اور کثرت کی بحث چھیڑ کر انسانی زندگی کو فنا کی تعلیم دیتا ہے۔ مثنوی "اسرارِ خودی" میں وہ فرماتے ہیں کہ:

راہبِ دیرینہ افلاطون حکیم — از گروہِ گوسفندانِ قدیم
رخشِ او در ظلمتِ معقول گم — در کہستانِ وجود افگندہ سم

گفت سرِ زندگی در مردن ست — شمع را صد جلوہ از افسردن ست

گوسفندے در لباس آدم ست — حکمِ او بر جانِ صوفی محکم ست

منکرِ ہنگامۂ موجود گشت — خالقِ اعیانِ نامشہود گشت[۹]

اسی چیز کو اقبال نے اپنے فلسفۂ خودی کے اجمالی خاکے میں جو انہوں نے ڈاکٹر نکلسن کے لئے تیار کیا تھا اس طرح بیان کیا ہے:-

"... میری رائے میں انسان کا مذہبی اور اخلاقی منتہائے مقصود یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دے یا اپنی خودی کو فنا کر دے بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی ہستی کو قائم رکھے، اور اس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے اندر بیش از بیش انفرادیت پیدا کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تخلقو باخلاقِ اللہ، یعنی اپنے اندر صفات الٰہیہ پیدا کرو۔ پس انسان جس قدر خدا سے مشابہ ہو گا اسی قدر اس کے اندر شانِ یکتائی اور رنگِ انفرادیت پیدا ہو جائے گا۔"

اقبال صفاتِ الٰہیہ کا حصول اسی لئے ضروری قرار دیتے ہیں کہ اس سے شانِ یکتائی پیدا ہو سکے اور انسان صحیح معنی میں خدا کی نیابت حاصل کر سکے جو اس کا منصب ہے اور اس خودی اور خود شناسی کو اپنائے جو دستورِ الٰہی کی اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہی سے عبارت ہے۔ نفی خودی اور فنا کا مسئلہ مغلوب اور محکوم قوموں کے لئے مخصوص ہے۔ "اسرارِ خودی" کے شروع میں وہ رومی کے ان اشعار کو مشعلِ ہدایت سمجھتے ہیں:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زین ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

دنیا اور دین دونوں کی ہر منزل پر ایک رہبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اقبال بھی ایک مرشد اور رہبر کو تلاش کرتے ہیں اور یہ ہستی انہیں رومی (المتوفی ۶۷۲ھ) کی ذات میں نظر آتی ہے جو زندہ رہنا سکھاتے ہیں۔ وہ جگہ جگہ رومی کا ذکر کرتے ہیں:

مرشدِ رومی حکیم پاک زاد   سرِ مرگ و زندگی بر ما کشاد

بیا کہ من زخم پیرِ روم آوردم
مئے سخن کہ جوان تر ز بادۂ عنبی ست

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

این فروتر رفت وتا گوہر رسید آن بہ گرد ابے چو خس منزل گرفت

"جاوید نامہ" میں جو روحانی سفر اقبال کو درپیش آتا ہے اس میں رومی ہی کی روح سے رہبری حاصل ہوتی ہے اور "بالِ جبریل" کے آخر میں پیرِ رومی سے جو ہدایات حاصل کی گئی ہیں وہ ان کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہے جس کا تعلق "دانشِ برہانی" سے نہیں بلکہ "دانشِ نورانی" سے ہے۔ "جاوید نامہ" میں اقبال کہتے ہیں :

کارِ حکمت دیدن و فرسودن ست کارِ عرفاں دیدن و افزودن ست

آں بسنجد در ترازوے ہنر ایں بسنجد در ترازوے نظر

آں بدست آورد آب و خاک را ایں بدست آورد جانِ پاک را

کارِ عرفان یا "دانشِ نورانی" کا تعلق عشق و وجدان سے ہے جہاں عقل گم ہو جاتی ہے اور

ع بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم۔ پیرِ رومی نے دوسرے صوفیہ کی طرح نفی خودی بے شک کی ہے لیکن اس "نیست" کی مثال اس طرح دی ہے :

چون زبانۂ شمع پیشِ آفتاب نیست باشد ہست باشد در حساب

ہست باشد ذاتِ او تا تو اگر بر نہی پنبہ بسوزد زاں شرر

نیست باشد روشنی نہ دہد ترا کردہ باشد آفتاب او را فنا

یعنی شمع کا شعلہ آفتاب کے آگے ہست بھی ہے اور نیست بھی۔ ہست اس طرح ہے کہ شمع کے شعلے کو روئی دکھائی جائے گی تو وہ روئی جل جائے گی اور نیست اس طرح ہے کہ آفتاب کی موجودگی میں شمع کی لو روشنی کیا دے سکے گی؟ اس مثال سے واضح ہے کہ

رومی مطلق نفی کے قائل نہیں اور وہ تو عشق کو مقصودِ حیات سمجھتے ہیں کیوں کہ اسی کی بدولت خفیہ صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

علتِ عاشق ز علتہا جداست　　　　عشق اصطرلابِ اسرارِ خداست

"میلادِ آدم" میں اقبال نے بھی اسی عشق کی سرشت اس طرح بیان کی ہے:

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد

"بالِ جبریل" میں اس طرح کہتے ہیں:

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب و گِل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں
عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

پھر سب سے بڑی چیز جو اقبال کو رومی کے یہاں پسند ہے وہ ان کی سخت کوشی کی تعلیم ہے۔ رومی کا یہ مصرع کس قدر بلیغ اور معنی خیز ہے:

کوششِ بیہودہ بہ از خفتگی

اقبال بھی مسلسل کوشش اور پیہم جستجو کو زندگی اور بیداری کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی، انگبیں

چیتے کا جگر چاہیئے، شاہیں کا تجسس

جی سکتے ہیں بے روشنی دانش و فرہنگ

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

زندگی در جستجو پوشیدہ است　　اصلِ او در آرزو پوشیدہ است

دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات　　غیرِ حق میرد چو او گیرد حیات

تصوف میں فقر و استغنا بھی بہت ضروری ہے۔ سوائے خدا کے کسی کا محتاج نہ ہونا ہی اصل فقر ہے جس پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کیا ہے۔ "الفقر فخری" اور "لی خرقتان الفقر والجہاد" اسی فقر کی تشریح ہے۔ صوفیہ کا بھی یہی معمول ہے کہ وہ سوائے اللہ کے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ اقبال بھی کہتے ہیں:

آنکہ خاشاکِ بتاں از کعبہ رُفت　　مرد کاسب را حبیب اللہ گفت

وائے بر منت پذیرِ خوانِ غیر　　گردنش خم گشتۂ احسانِ غیر

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ

ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہی

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ

پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر
فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ

مختصر یہ کہ اقبال نے نام نہاد تصوف سے انکار کیا ہے لیکن ایسے تصوف اور ایسے صوفی کے لئے سفارش کی ہے جو مشتِ خاک کو کیمیا بنا سکے۔

کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے　　　بوسہ زن بر آستانِ کاملے

حواشی

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھیں پروفیسر ضیاء احمد بدایوانی، "مباحث و مسائل" (دہلی، ۱۹۶۸)، ص ۲۰ بعد۔ ۲۔ "مکتوبات"، دفتر دوم، مکتوب ۴۴۔

۳۔ شیخ عطاء اللہ، مرتب، "اقبال نامہ" حصہ اول، صفحہ ۱۱۰۔

۴۔ "مکتوبات"، دفتر اول، مکتوب ۲۶۱ میں ہے: "اگر شمۂ از حقیقتِ کمالات صلواتیہ برایشان منکشف شدے ہرگز دم از سماع و نغمہ نزدندے ویاد وجد و تواجد نہ کردندے..."

۵۔ شیخ عطاء اللہ، مرتب، کتاب مذکور، حصہ اول، ص ۳۵-۳۶۔

۶۔ ایضاً، صفحہ ۸، ۷-۹۔

۷۔ ایضاً، صفحہ ۴۱۹-۴۲۰۔

۸۔ محمود نظامی، مرتب، "ملفوظات"، ص ۱۲۲۔

۹۔ حکما کے درمیان بحث تھی کہ اشیائے کائنات کا علم انسان کو حاصل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ افلاطون اپنے استاد سقراط کی طرح کہتا تھا کہ یہ علم صرف کلیات

GENERAL

(UNIVERSAL TRUTHS) تصورات (CONCEPTS) اور عالمگیر صداقتوں iDEAS
سے حاصل ہو سکتا ہے، لیکن اشیا چونکہ ہر وقت متغیر ہوتی رہتی ہیں، اس لئے ان کا
علم حقیقی اور اصلی نہیں۔ (صرف اعیان (iDEAS) کا علم حقیقی ہو سکتا ہے۔) اسی لئے
دنیا میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ لائقِ اعتبار نہیں، یعنی افلاطون نے عالمِ موجودات کا انکار
کیا اور عالمِ غیر محسوس کا اثبات کیا۔ اس کے اس فلسفے سے مسلمانوں کی قوتِ عمل افسردہ
ہو گئی۔

۱۰۔ پروفیسر ضیاء احمد بدایوانی نے کتاب مذکور (ص ۳۴۰ بعد) میں اس موضوع
پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

ترجمانِ خودی

"ترجمان خودی" یعنی علامہ اقبال کی فارسی مثنوی "اسرارِ خودی" کا منظوم اردو ترجمہ جو آنربیل جسٹس شیخ عبدالرحمٰن صاحب نے کیا ہے اور کاروان پریس لاہور سے شائع ہوا ہے۔ اس کتاب میں ظاہری اور معنوی محاسن یک جا ہو گئے ہیں۔ طباعت اور کتابت کے علاوہ ملک کے مشہور آرٹسٹ جناب عبدالرحمٰن چغتائی کی حاشیہ آرائی۔ اور ظاہری خد و خال کی رعنائی بہت زیادہ جاذب نظر ہے۔ یعنی ایک عبدالرحمٰن نے معنوی محاسن پیدا کئے اور دوسرے عبدالرحمٰن نے ظاہری زیبائش سے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا ہے پھر نور علیٰ نور یہ کہ علامہ اقبال کے خاص شیدائی اور پاکستان کے جلیل القدر فلسفی جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے اس منظوم ترجمے پر مقدمے کا اضافہ بھی کیا ہے۔ جو اپنی جگہ خود اہم چیز ہے۔

اسرارِ خودی کا ایک اور منظوم اردو ترجمہ اس سے قبل ۱۹۲۷ء میں جناب پروفیسر عبدالرشید صاحب فاضل شایع کر چکے تھے اور وہ ترجمہ بھی اقبال کی بحر میں نہیں ہے: تاہم وہ بھی خاصا ہے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند اشعار کا ترجمہ پیش کیا جائے تمہید میں اشعار ہیں کہ

ماد شب چون مہر عالم تاب زد | گریۂ من بر رخ گل آب زد
اشک من از چشم نرگس خواب شست | سبزہ از ہنگامہ ام بیدار رست
باغبان زور کلامم آزمود | مصرعے کارید شمشیرے درود

ان اشعار کا ترجمہ جناب عبدالرشید صاحب نے اس طرح کیا ہے۔

کاروانِ شب جو لوٹا مہر عالم تاب نے | نیند کھو دی گل کی میرے گریۂ بیتاب نے
اشکِ غم نے دھوئیں آنکھیں نرگسِ خوابیدہ کی | جاگ اٹھا نالوں سے میرے سبزۂ بیگانہ بھی
باغباں نے آزمایا جو میرا زورِ کلام | بو یا اک مصرع ملی حاصل میں تیغ بے نیام

لیکن جسٹس عبدالرحمٰن کا ترجمہ یوں ہے۔

متاعِ شب کو لوٹا جس گھڑی سورج کی کرنوں نے
دیئے چھینٹے رخِ گل پر چمن میں میرے اشکوں نے
جگایا چشمِ نرگس کو میری آنکھوں نے رو رو کر
اُگا سبزہ مری آواز سے بیدار ہو ہو کر
مرے زورِ سخن کی باغباں نے آزمائش کی
جہاں مصرع مرا بویا وہاں شمشیر اگ آئی

ان دونوں ترجموں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالرشید صاحب نے کامیابی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ اور وہ ترجمہ ہی ہے۔ اس کے برعکس عبدالرحمن صاحب کے ترجمے میں ادبی نکتہ آفرینیوں کی وجہ سے اصلیت پیدا ہو گئی ہے

اور وہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتا۔

مثنوی کی پہلی فصل جس میں خودی کو نظامِ عالم کی اصل کہا گیا ہے عبدالرشید صاحب کے یہاں اس طرح ہے۔

ہم جہاں کہتے ہیں جس کو ہیں آثارِ خودی — دیکھتی ہے آنکھ جو کچھ ہیں یہ اسرارِ خودی

سو رہی تھی جب خودی غیرِ خدا کچھ بھی نہ تھا — جاگتے ہی عالمِ پندار پیدا ہو گیا

ایسے عالم سیکڑوں پوشیدہ اس کی ذات میں — ہے وجودِ غیر اس کی ذات کے اثبات میں

عبدالرحمٰن صاحب لکھتے ہیں۔

جہاں میں پیکرِ ہستی خودی کی اک نشانی ہے — جدھر دیکھیں اُدھر رازِ خودی کی ترجمانی ہے

خودی کے قلبِ خفتہ میں جو بیداری کا نور آیا — ہویدا ہو گئی تب عالمِ پندار کی کایا

جہانوں کے جہاں کتنے پڑے ہیں ذات میں اس کی — وجود اس کا اگر مانیں تو پھر ہے غیر کی ہستی

ان اشعار میں عبدالرشید صاحب کا ترجمہ بہتر معلوم ہوتا ہے عبدالرحمٰن صاحب کے ترجمے میں "کایا ہویدا ہو گئی" روزمرہ نہیں ہے۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ عبدالرحمٰن صاحب کا ترجمہ مجموعی طور پر بہت اچھا ہے۔ ادبی چاشنیاں جگہ جگہ ہیں جو ان کے اعلیٰ ادبی ذوق پر شاہد ہیں۔ اور سب سے بڑی یہ بات ہے کہ انھوں نے اکثر مقامات پر ایسے بر جستہ مصرعے اور اشعار پیش کئے ہیں کہ ترجمے کے باوجود اصل کا لطف آجاتا ہے۔ مثلاً "خودی کی زندگی تخلیقِ مقاصد ہے" ایک فصل ہے اس میں چند اشعار یہ ہیں۔

کیئے جا دل کی تاریکی میں شمعِ آرزو روشن
کہ تیرا پیکرِ خاکی نہ بن جائے ترا مدفن

جہانِ رنگ و بو زندہ، تمنا کی بدولت ہے
ازل سے آرزو ہر شے کی فطرت میں امانت ہے
اسی سے خاکیوں میں طاقتِ پرواز آتی ہے
کلیمِ عقل کو یہ خضر بن کر رہ دکھاتی ہے
تمنا جب نہ پیدا کر سکے دل، دل نہیں رہتا
پرِ پرواز کھو کر وہ کسی قابل نہیں رہتا

ان اشعار میں یقیناً اصل کا لطف آتا ہے جو عبدالرحمٰن صاحب کی قدرتِ زبان اور غیر معمولی ذہانت کا ثبوت ہے۔

کتاب کے شروع میں ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب کا مقدمہ بجائے خود ایک قیمتی اضافہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کو اقبالیات کے سلسلہ میں جس قدر تجربہ حاصل ہے اور ملک کے مفکرین میں جو مقام انہیں حاصل ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ انھوں نے فلسفہ کی اجمالی تاریخ پیش کرتے ہوئے نفیِ خودی کی پیدا کردہ بے عملی اور بے حسی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ — تصوّف کے ایک حصے پر اس مقدمہ میں افلاطونی رنگ چڑھ گیا اور صوفی نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ

چشم بند و لب بہ بند و گوش بند
گر نہ بینی نورِ حق بر من بخند

ڈاکٹر صاحب نے یہ شعر افلاطونی رجحان کے ذیل میں پیش کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس شعر کا اس رجحان سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے یہ شعر دراصل حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ سے نسبت رکھتا ہے جو ان کے مراقبے سے متعلق ہے۔ اُن کے نزدیک مراقبہ ایک مشق ہے جو نماز اور

مختلف عبادات میں خشوع و خضوع پیدا کرنے کے لئے عمل میں لائی جاتی ہے اور اس چیز کی نوعیت وہی ہے جو دوسرے سلسلوں کے افکار کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ صوفیہ نے بعض عجمی چیزیں اختیار کر لی ہیں۔ لیکن جس طرح عام مسلمانوں کی حالت دیکھ کر اسلام کے متعلق رائے قائم کرنا غلط ہے۔ اسی طرح صوفیہ کو دیکھ کر تصوف اور "احسان" کے متعلق رائے قائم کرنا صحیح نہیں ہے سنائی، عطار، رومی، غزالی، حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ حضرت سید احمد بریلوی، شاہ اسمٰعیل شہید، مولانا محمد علی، مولانا سلیمان ندوی اور خود ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم صوفی تھے اور ان بزرگوں نے مختلف قسم کے جہاد کیئے اور اسی قسم کے وہ صوفی بھی تھے جن کی بدولت اسلام پھیلا اور آج بھی اسلام موجود ہے ورنہ ملکی سیاست کی وجہ سے ارباب حل و عقد کو کبھی تبلیغ کی توفیق ہی نہیں ہوئی مسلسل کوشش اور پیہم جستجو کا جذبہ انھیں بزرگوں کی تعلیم اور عمل سے پیدا ہوا ہے اور تمام باطنی امراض کا علاج بھی ان روحانی طبیبوں سے ہوا کرتا ہے اقبال نے بھی یہی کہا ہے۔

دربارِ شہنشہی سے خوشتر مردانِ خدا کا آستانہ

اور ایک مشہور قطعہ ہے

دمِ عارف نسیم صبحدم ہے اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسّر شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

بہر حال اس منظوم ترجمے کی بدولت ڈاکٹر صاحب موصوف کا ایک بیش قیمت مقالہ میسر آ گیا ہے اور یقیناً کارواں پریس والوں کی یہ کوشش مشکور اور بہت زیادہ قابل قدر ہے۔

اشاریہ

اشخاص

الف

ب

ت

ٹ

ث

ج

چ

ح

خ

مقامات

کُتب